۷۵۵۳
۱۴۷۴۱۱

تذکرۂ اہل دل

تصنیف

ڈاکٹر مولانا سعید الرحمن اعظمی ندوی
مدیر ماہنامہ البعث الاسلامی، لکھنؤ
مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

ترجمہ

مطیع الرحمن عوف ندوی
دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب ـــــــــ تذکرۂ اہل دل

تصنیف ـــــــــ مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی

ترجمہ ـــــــــ مطیع الرحمٰن عوف ندوی

ناشر ـــــــــ مکتبۂ فردوس

صفحات ـــــــــ 206

قیمت ـــــــــ 70/=

مطبع ـــــــــ کاکوری آفسیٹ، لکھنؤ

تعداد ـــــــــ ایک ہزار

سنہ طباعت ـــــــــ ذوالحجہ ۱۴۲۶ھ - جنوری ۲۰۰۶ء

مکتبہ فردوس

مکارم نگر، لکھنؤ

ملنے کے پتے

مکتبہ ندویہ ، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

مکتبہ الفرقان، نظیر آباد، لکھنؤ

مکتبۃ الحرمین، مرکز مسجد، امین آباد، لکھنؤ

صدیقی کتاب گھر، امین آباد، لکھنؤ

۷۵۵۳
۱۴۷۴۱۱

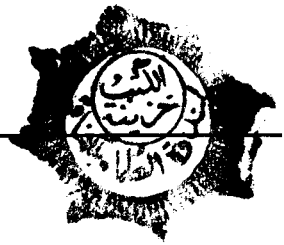

فہرست مضامین

مقدمہ	حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی	۵
پیش لفظ	مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی	۸
عرض مترجم	مطیع الرحمٰن عوف ندوی	۱۱
۱	حضرت جنید بغدادیؒ	۱۳
۲	شیخ شرف الدینؒ یحیٰ منیری	۲۰
۳	شیخ فرید الدین گنج شکرؒ	۳۲
۴	شیخ معین الدین چشتیؒ	۳۸
۵	شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ	۴۴
۶	قطب الدین بختیار کاکیؒ	۵۰
۷	شیخ احمد سرہندیؒ	۵۶
۸	شیخ محمد معصوم سرہندیؒ	۶۶
۹	سلطان اورنگ زیب عالمگیرؒ	۷۶
۱۰	شاہ علم اللہؒ	۸۴
۱۱	شیخ الاسلام شاہ ولی اللہ دہلویؒ	۹۶
۱۲	شاہ عبد العزیز دہلویؒ	۱۰۴
۱۳	شاہ اسمٰعیل شہیدؒ	۱۱۲
۱۴	سید احمد شہیدؒ	۱۲۲
۱۵	مولانا ولایت علی صادقپوریؒ	۱۶۲
۱۶	حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ	۱۷۶
۱۷	مولانا محمد قاسم نانوتویؒ	۱۸۶
۱۸	مولانا رشید احمد گنگوہیؒ	۱۹۴
۱۹	مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ	۲۰۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

از: حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب دامت برکاتہم
ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ وصدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

الحمد للہ رب العالمین، والصلوٰۃ والسلام علی سیدالمرسلین وخاتم النبیین محمد، وعلیٰ آلہ وصحبہ اجمعین۔ وبعد:

اللہ تعالیٰ نے انسان کے مزاج میں ایک دوسرے سے سیکھنے اور ایک دوسرے کے اخلاق وروحانات سے استفادہ کرنے کی صفت رکھی ہے، اس صفت کی بناء پر انسانوں کے اخلاق وصفات بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں، اور اس صورت حال کے پیش نظر اچھے صفات کے حامل لوگوں کی صحبت اختیار کرنے کی تلقین کی گئی ہے، خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کی سعادت حاصل کرنے والوں کو انسانوں کی منتخب ترین جماعت قرار دیا گیا، ان کو ایسی ذات کی صحبت ملی جس کی عادات وصفات کو خاص رب العالمین کی دیکھ بھال حاصل تھی، اور ان کی عادات وصفات کی تشکیل پوری طرح رب العالمین کی منشاء وپسند کے مطابق انجام پائی، انسانی تاریخ کے مطالعہ سے یہ حقیقت ظاہر وباہر ہوتی ہے کہ اچھی صحبت سے لوگ بنتے رہے ہیں، اور بری صحبت سے لوگ بگڑتے رہے ہیں، قرآن مجید میں قیامت کے روز کا حال بیان کرتے ہوئے جہنم میں جانے والوں کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ کاش میں نے اللہ کے رسول کا ساتھ دیکر راستہ اختیار کیا ہوتا، کاش میں فلاں کو اپنا دوست نہ بناتا، اس نے مجھ کو

گمراہی کے راستہ پر ڈالا۔

اچھے لوگوں کی صحبت کی اس اہمیت کو سامنے رکھتے ہوئے اچھے لوگوں کی تلاش اور ان کی صحبت اختیار کرنے کی طلب ہر سمجھ دار انسان کو ہونی چاہئے، اور اگر مطلوبہ نیک شخصوں کی صحبت کی صورت حاصل نہ ہو رہی ہو تو ان کے حالات زندگی سے کتابوں کے ذریعہ واقفیت حاصل کرنا چاہئے، اس طرح اگر براہ راست ان کی صحبت حاصل نہیں ہوتی ہے تو اس کا کسی حد تک بدل اور قائم مقام ان کے حالات زندگی ہو جاتے ہیں، جو ان کے صلاح وتقویٰ، رضائے الٰہی کی طلب، سب کے ساتھ حسن سلوک، محبت و ہمدردی اور غمخواری، شرافت نفس اور اخلاص عمل کے تذکروں پر مشتمل ہوتے ہیں، ان کتابوں میں ان کے حالات زندگی پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا ہم ان کی مجلس میں بیٹھے ہیں، اور ان کے اخلاق وصفات کا بچشم خود مشاہدہ کر رہے ہیں۔

بات یہ ہے کہ بزرگ شخصیتوں اور حسن عمل کے حامل افراد کے تذکرے بھی بڑی افادیت کے حامل ہوتے ہیں، اور اچھے انداز میں ان کو پیش کرنے والوں کی تحریروں میں ان کی شخصیتوں کا عکس آجاتا ہے، اور یہ کام انسانوں کی زندگیوں کی صحیح تشکیل وتعمیر میں بہت معاون بنتا ہے، اس موضوع پر لکھی گئی کتابوں کو لوگ دلچسپی سے پڑھتے بھی ہیں، کیونکہ انسانوں میں خیر کو پسند کرنے کا جذبہ رب العالمین کی طرف سے ودیعت کیا گیا ہے وہ ایسے تذکروں کو پڑھنے کی طرف مائل کرتا ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ اہل قلم حضرات اس موضوع کو بھی برابر اختیار کرتے رہے ہیں، اور حسن نیت کے ساتھ لکھنے والوں کا جذبہ بھی ان کی تحریر میں شریک ہوتا رہا ہے، ایسی کتابیں جو نیک اور صالح لوگوں اور بزرگ شخصیتوں کے حالات پر مشتمل ہوں بڑی لائق قدر ہیں۔

مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ بھی ان اہل قلم میں ہیں جنہوں نے اس موضوع کو بھی اپنا لیا، اور ہندوستان کی عظیم ہستیوں کے حالات زندگی پر مضامین تحریر کئے جو رسالوں میں شائع ہوئے، ان کا ایک مجموعہ عربی میں مرتب ہو کر شائع

ہوا، اور اس مجموعہ مضامین کا ترجمہ مولوی مطیع الرحمٰن عوف نے اچھی سلیس اردو میں کیا۔ عزیز موصوف ندوۃ العلماء کے فاضل اور عربی و اردو کے اچھے واقف اور ترجمان ہیں ان کا یہ ترجمہ اشاعت پذیر ہو رہا ہے۔

ہم امید کرتے ہیں کہ یہ مجموعہ بہت نافع ثابت ہوگا، اور اس کے پڑھنے والوں کو اچھے اخلاق وصفات صدق وصفا کے واقعات کا علم ہو کر ان کی زندگیوں سے فیض حال ہوگا، اور ان کے تحریر کرنے والے کو اس کی بہتر جزاء حاصل ہوگی۔

محمد رابع حسنی ندوی

ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ

۲۰۰۴/۴/۱۴ء

۱۵۲۵/۲/۲۳ھ

پیش لفظ

بقلم مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن صاحب اعظمی ندوی
مدیر ماہنامہ البعث الاسلامی، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی امابعد!

اسلامی تاریخ ممتاز شخصیات کے ذکر سے معمور ہے، ان شخصیات کا تذکرہ، ان کی زندگی کے حالات، اوران کی سیرت وکردار کی نمائندگی ان کی زندگی کے ہر گوشہ میں درجہ کمال کے ساتھ پائی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں ایک دائمی اسوہ اور علم وعمل کے ایسے انمٹ نقوش ودیعت فرمائے ہیں جو ایمان وعمل کا سرچشمہ اور سچائی اور حقیت پسندی کا ایک روشن مینار ہیں، اسکی روشنی میں چل کر زندگی کا صحیح مقصد حاصل ہوتا ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ سے سچی وابستگی کی شان میسر آتی ہے۔

ایسے ہی بے شمار اللہ کے بندوں نے یہ سعادت حاصل کی ہے اور اسلامی تاریخ ان کے تذکرہ سے منور اور مزین ہے، اس موضوع پر بہت سی کتابیں اہل علم ودانش نے تصنیف کی ہیں، اوران کی اسلامیت اور حقیقت پسندی کو نمایاں کیا ہے اور اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نقوش کو ان کی زندگی کے ہر گوشہ میں پیش کرنے اور اس کی روشنی میں چل کر کامیابی کی منزل تک پہونچنے کی حقیقت کو آشکارا کیا ہے۔

ہر عصر میں اہل قلم نے ان مثالی شخصیتوں کے حالات زندگی کو جمع کر کے ان کو سامان عبرت کے طور پر اپنی تحریروں اور تصنیفات میں جلوہ گر کیا ہے، اور ان کی حقیقی سیرت نگاری کے نمونے پیش کر کے اسلام کی صداقت اور اس کے مکمل اور دائمی نظام زندگی ہونے کا ثبوت پیش کیا ہے، یہ تاریخی شخصیتیں صحیح معنوں میں انسان سازی کے میدان میں عملی نمائندگی کا زندہ جاوید نمونہ ہیں، ان کے حالات پڑھنے اور سننے کے بعد زندگی میں ایک محسوس انقلاب کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور زندگی کے بہت سے تاریک گوشے ان سے روشنی حاصل کرتے ہیں، اور کامیاب معاشرہ کی تعمیر میں زبردست مدد ملتی ہے۔

اسی مقصد کے پیش نظر اہل علم و دانش نے اپنے اپنے زمانہ میں اہل دل مصلحین کی تاریخ کو قلمبند کرنے کی سعادت حاصل کی ہے، یہ مختصر تالیف بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی شمار کئے جانے کے قابل ہے، اور اس کا مقصد سوائے اسکے کچھ نہیں ہے کہ اہل قلوب اور مخلصین و مصلحین علماء کے حالات پڑھ کر ہمارے حالات کی اصلاح ہو اور زندگی کے ناقص گوشوں کو مکمل کرنے اور اللہ تعالیٰ سے اپنا رشتہ استوار کرنے اور زندگی کو با مقصد بنانے کی راہ میں کسی قدر پیش رفت ہونے کی سعادت میسر آئے اور جو کام بڑی بڑی تقریروں اور عظیم تصنیفات سے آسانی کے ساتھ نہ ہو سکے اس مختصر طریقہ سے اس قسم کے تذکروں سے پورا ہو جائے۔

پیش نظر کتاب اصل میں عربی مقالات کا اردو ترجمہ ہے جو ندوۃ العلماء سے شائع ہونے والے مشہور عربی ماہنامہ ''البعث الاسلامی'' میں اشاعت پذیر ہو چکے ہیں، یہ مقالات ''ساعة مع العارفین'' کے نام سے مستقل کتاب کی صورت میں شائع ہو چکے ہیں اور مصر کے مشہور مرکز اشاعت 'دار الاعتصام' نے اسے ۱۹۷۸ء میں شائع کیا تھا، ابھی اسکا دوسرا ایڈیشن بھی مصر ہی کے ایک مشہور ادارہ دار المقطم سے نئے اضافہ اور مقدمہ کے ساتھ شائع ہو گیا ہے۔

اس کتاب کا اردو ایڈیشن حضرت مولانا سید ابو الحسنؒ ندوی کے جانشیں

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے قلم سے مزین ہے، اس کے لئے ہم حضرت مولانا کے نہایت شکر گزار ہیں اور یقین کرتے ہیں کہ اس کی برکت سے کتاب کو مزید مقبولیت اور افادیت حاصل ہوگی، الحمد اللہ اس کتاب کا اردو سلیس ترجمہ ہمارے دوست مولانا مطیع الرحمٰن عوف صاحب ندوی نے کچھ عرصہ قبل کر کے اردو داں طبقہ کے لئے بطور ایک تاریخی تذکرہ کے طور پر پیش کر دیا ہے، اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائیں، اور کتاب کو قبول عام بخشیں۔ اس کتاب کی طباعت کی ذمہ داری قبول کرنے والے حضرات کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل وکرم سے ان کو اس عمل کی بہترین جزاء عطا فرمائیں، اور اس کو دین و دنیا ہر اعتبار سے قبول فرمائیں، (آمین) ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم۔

مخلص

(سعید الرحمٰن الاعظمی الندوی)
مدیر مجلۃ البعث الاسلامی، لکھنؤ

۷ر جمادی الاولیٰ ۱۴۲۶ھ
مطابق ۱۵ر جون ۲۰۰۵ء

عرض مترجم

جب دنیا مادیت، نفس پرستی اور ظاہری چمک دمک کے سحر میں گرفتار اور اس کے دام ہمرنگ کی اسیر ہوجاتی ہے اور ہر شخص صرف ظاہری معیار زندگی اور مادیت کو سب کچھ سمجھنے لگتا ہے تو ایسے وقت میں کچھ خاصان خدا اور اولیاء اللہ ایسے بھی ہوتے ہیں جو مادیت کے ان مظاہر اور ظاہر پرستی کی اس وبا کے خلاف اپنے قول وعمل سے جہاد کرتے ہیں اور نظروں کو خیرہ کرنے والی مادی وتہذیبی چمک دمک سے اپنا دامن بچائے رکھتے ہیں۔

ایسے لوگ انسانیت کا نمک اور کائنات کا سرمایہ ہوتے ہیں، ان کی وجہ سے اس کائنات پر خدا کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں اور زندگی کی بہار اور دنیا کا بھرم ان کے دم سے قائم ہوتا ہے۔ ان کے اخلاق، ان کا کردار، ان کا انداز فکر ونظر ان کی رفتار وگفتار، ان کے شب وروز خدا کی بندگی سے لبریز اور پرستش سے خالی ہوتے ہیں اور وہ مادی زندگی کے ان مظاہر کو سرمو اہمیت دینے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

اسلامی تاریخ کا یہ خاص امتیاز ہے کہ یہاں ہر دور میں ایسے مردان کار اور مادیت ونفس پرستی سے آنکھیں ملانے والے ارباب صدق وصفا پیدا ہوتے رہے، علماء، صلحاء، مصلحین، مجددین، مصنفین، مفکرین، نیز وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل کی صدا لگانے والے اور خاک کی آغوش میں تسبیح ومناجات سے لذت یاب ہونے والے پوری فراوانی کے ساتھ موجود رہے ہیں جن کے دم قدم سے زندگیوں میں انقلاب اور حالات میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے، ان کی صحبت کی تاثیر سے بندگان خدا کو رجوع الی الحق اور خدا پرستی کی لذت حاصل ہوتی ہے اور زمانہ کا رخ مادیت کی پرستش سے حق پرستی کی طرف مڑ جاتا ہے۔ ان حق پرست وحق آگاہ شخصیات کی صحبت اور ہم نشینی سے عشق ومحبت کی یہ گرمی اور گفتار وکردار کی یہ پختگی دوسرے افراد میں بھی منتقل ہوتی رہی، چراغ سے چراغ جلتے رہے اور صحبت وتربیت کی کیمیا گری اور اثر انگیزی کا یہ سلسلہ ہر دور میں اسی طرح جاری رہا۔

جس طرح بزرگوں کی صحبت اور ہم نشینی کی اہمیت اور اس سے استفادہ مسلمہ ہے اسی طرح ان کی سوانح، ان کے احوال وکوائف، اور موئے قلم سے کھینچی ہوئی ان کی زندگی کی متحرک تصویروں کی

افادیت سے بھی انکار ممکن نہیں۔ اسی لئے ان خدا آشنا بندوں کے ملفوظات وسوانح کو ان کی صحبت کا بدل تسلیم کیا جاتا ہے اور ذاتی زندگی کی صحبت کی طرح ان کے تذکروں سے استفادہ کیا جاتا ہے۔

موجودہ زمانہ میں مادیت اور نفس پرستی کا یہ سلسلہ پہلے سے زیادہ تباہ کن بن گیا ہے اور اس کے مہلک اثرات پورے معاشرہ کو اپنی لپیٹ میں لے رہے ہیں اس لئے ان حالات میں ہلکے پھلکے مؤثر انداز کے ایسے تذکروں اور سوانح حیات کی اہمیت دوچند ہوگئی ہے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے عالی مقام مہتمم، اور عربی زبان وادب کے ممتاز ادیب وانشاپرداز جناب ڈاکٹر مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی (ایڈیٹر مجلہ البعث الاسلامی) نے مدتوں پہلے ایسی ہی ضرورت کا احساس کر کے عربی زبان میں اولیاء اللہ اور کاملین کا ایک بہت مفید سلسلہ تحریر فرمایا تھا جو بعد میں "ساعة مع العارفین" کے نام سے کتابی شکل میں متعدد بار شائع ہوا۔ کتاب کا اسلوب بہت سلیس اور رواں ہے اور شخصیات کے ان پہلوؤں کو خصوصیت کے ساتھ نمایاں کیا گیا ہے جن میں عبرت وبصیرت کا وافر سامان موجود ہے۔ اس لئے یہ کتاب نئی نسل کے لئے ایک سوغات ہے اور موجودہ حالات کے لئے ایک مہمیز کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس لئے اپنے ملک کے اردو داں حضرات کے لئے اس کا اردو ترجمہ پیش کیا جارہا ہے۔ میں اپنے استاد گرامی قدر اور فاضل مصنف کا خاص طور پر شکر گزار ہوں جنہوں نے اس کے اردو ترجمہ کی اجازت دی اور مختلف مراحل میں دستگیری فرمائی۔ اس کے علاوہ گرامی منزلت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی ناظم ندوۃ العلماء وصدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کا بھی حد درجہ ممنون ومشکور ہوں جنہوں نے اپنے مصروف ترین لمحات سے وقت نکال کر کتاب پر نظر ڈالی اور مقدمہ تحریر فرمایا، اپنے رفقاء مولانا رشید احمد اعظمی استاذ دارالعلوم اور مولانا وصی سلیمان ندوی ایڈیٹر 'ارمغان' اور ان تمام محسنین کے لئے دل شکر وسپاس سے لبریز ہے جن کا اس کتاب کی اشاعت میں تعاون حاصل رہا، اللہ تعالیٰ ان تمام حضرات کو جزاء خیر عطا فرمائے۔

ان الفاظ کے ساتھ کتاب کا یہ اردو ایڈیشن اپنے معزز قارئین کی نذر ہے۔

سپردم بتو مایۂ خویش را

مطیع الرحمٰن عوف ندوی

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

حضرت جنید بغدادیؒ

ابوالقاسم جنید بن محمد بن جنید کاروان ملت اسلامیہ کے امیر اور ان کے قافلہ سالار تھے، وہ حقیقت میں سلوک ومعرفت کے امام اور ایک معروف شیخ طریقت تھے، وہ اپنے دور کے اولیاء کرام میں نمایاں حیثیت اور ممتاز مقام کے حامل اور اہل تصوف کے سرخیل تھے، اور بیک وقت وہ علم ومعرفت، بصارت وبصیرت اور تفقہ وتقویٰ کے پیکر مجسم تھے، اور یہ صفات ان کا سرمایۂ امتیاز تھیں۔ انہوں نے محض گفتار کا میدان ہی سر نہیں کیا بلکہ وہ کردار کے بھی غازی بنے، انہوں نے امت مسلمہ کے اندر پھیلے ہوئے فساد وبگاڑ کو دور کیا، کج روؤں اور گم کردہ راہ افراد کی اصلاح کا سامان کیا، اور جہاں جہاں کوتاہیاں اور بے احتیاطیاں سرایت کر چکی تھیں، ان کو خوبیوں اور رشد وصلاح سے بدل دیا۔ اور ملت اسلامیہ کے پارہ پارہ وجود کو اتحاد وجمعیت عطا کی، اور قوم مسلم کی بکھری ہوئی موتیوں کو ایک لڑی میں پرو کر انہیں خوبصورت ہار کی شکل عطا کی، اور ان کو طاقت وقوت بخشی، انہیں ممتاز خصوصیات کی بنا پر وہ دیگر تمام معاصر علماء وحکماء اور مصلحین پر فوقیت لے گئے، اور علم ومعرفت کے میدان میں انہوں نے تن تنہا اپنی سیادت وامامت کا علم بلند کیا، یہاں تک کہ انہوں نے تقویٰ وایمان کی بلند ترین چوٹیوں کو سر کر لیا، اور صفات ایمانی میں اولین مقام حاصل کیا، حضرت جعفر خلدی ان کے بارے میں اپنے تأثرات اس طرح بیان کرتے ہیں۔

''میں نے اپنے شیوخ میں سے کسی بھی شخصیت کے اندر جنید بغدادی کی طرح بیک وقت کردار و گفتار اور علم و عمل کو ہم آہنگ نہیں دیکھا، اگر آپ ان کے تعلیمی پہلو پر غور کریں گے، تو ان کا علم ان کے اعمال و کردار پر فائق پائیں گے اور اگر کردار عمل کے پہلو پر نظر ڈالیں گے تو اسے علم و معرفت پر غالب قرار دیں گے۔''

ابوالعباس بن سریج کے بارے میں ہے کہ ایک بار ان کے زور بیان کا لوگوں پر بہت اثر ہوا تو انہوں نے کہا کہ یہ محض حضرت جنید بغدادی کی صحبت کی برکت ہے۔

ابوالقاسم کعبی نے فرمایا کہ

'' میری نگاہوں نے اس روئے زمین پر اس جیسی ہستی نہیں دیکھی، لکھنے والے نے ان کے ایک ایک لفظ کو قلم بند کرنے کی غرض سے، فلاسفہ ان کی دور اندیشی و باریک بینی کی وجہ سے اور متکلمین ان کے علم و معرفت سے استفادہ کے لئے ان کی مجلس میں شرکت کے لئے بے چین رہا کرتے تھے، حضرت خلدی بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اس روئے زمین پر جو علم بھیجا ہے اور انسان کو اس کے حصول کے طریقے بتائے ہیں، اس میں سے ایک وافر حصہ اس ذات باری نے مجھے بھی عطا کیا ہے۔''

عبادت گذاری میں وہ بے مثال تھے، ان کی عبادت گذاری کے واقعات سن کر عقل حیران و ششدر رہ جاتی ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ انہیں عبادت خداوندی کا سچا ذوق مل گیا تھا جس کے ذریعہ وہ اللہ تعالیٰ سے ملنے اور ہر لحہ اس سے سرگوشی کی لذت و حلاوت محسوس کرتے تھے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ سے سرگوشی اور اس کے لقاء کی لذت کے لئے خلوت شرط اولین ہے، اس لئے وہ مسلسل کئی کئی گھنٹے عزلت نشیں ہو جاتے اور اللہ تعالیٰ سے ہمکلامی کی لذت حاصل کرتے، اور اس کا قرب تلاش کرتے رہتے تھے۔ حضرت خلدیؒ فرماتے ہیں: مجھے معلوم ہوا کہ حضرت جنید بغدادی اپنی دکان میں بھی روزانہ تین سو رکعت پڑھتے اور تیس ہزار تسبیحات کے ورد کا معمول بنائے ہوئے تھے، میں نے انہیں کہتے ہوئے

سنا کہ میں نے چالیس سال سے باقاعدہ آرام کرنے کی نیت سے کپڑے نہیں اتارے، بیس سال تک ان کا یہ معمول رہا کہ ہفتہ ہفتہ بھر کھانا نہ کھاتے اور اس حالت میں بھی وہ ہر رات چار سو رکعت نماز پڑھتے تھے۔

ابوالحسن المحلمیؒ فرماتے ہیں کہ

''میں نے حضرت جنید سے دریافت کیا کہ آپ نے یہ علم کہاں سے حاصل کیا؟ انہوں نے گھر کے ایک گوشہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: کہ تیس سال تک اس گوشہ میں اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہو کر۔''

اسماعیل بن جنیدؒ فرماتے ہیں کہ

حضرت جنید روزانہ بازار جاتے، اپنی دوکان کھولتے اور داخل ہونے کے بعد اس کا پردہ گرا دیتے، اور پھر چار سو رکعت نماز ادا کرتے، یہ ان کا روزانہ کا معمول تھا۔

ابوبکر العطارؒ فرماتے ہیں کہ

اپنے ساتھیوں کے ساتھ حضرت جنید کی خدمت میں ان کی وفات کے وقت حاضر ہوا، وہ بیٹھ کر نماز پڑھ رہے تھے، اور جب سجدہ کرتے تو پیروں کو ایک دوسرے پر رکھ لیتے وہ اسی طرح کرتے رہے یہاں تک کہ روح نکلنے لگی اور ان کا ہلنا ڈلنا مشکل ہو گیا، چنانچہ انہوں نے پیروں کو پھیلا دیا جن میں ورم تھا، بعض ساتھیوں نے دیکھا تو کہا کہ ابوالقاسم یہ کیا حالت بنا رکھی ہے! فرمایا: کہ یہ اللہ تعالیٰ کے احسانات وانعامات ہیں، اللہ اکبر، جب نماز سے فارغ ہوئے تو امام ابومحمد حریری نے کہا کہ یہ تو آرام کا وقت تھا؟ حضرت جنید نے فرمایا کہ اے ابومحمد! یہ تو جانکنی کا عالم ہے، گویا وہ یہ کہنا چاہ رہے تھے بزبان میر:

لگ رہا ہے ساقیا اب چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

اس کے بعد اللہ اکبر کہا اور چند ہی لمحوں میں اپنے محبوب حقیقی سے جا ملے۔

گذشتہ صفحات میں آپ نے نماز اور دعا وعبادات میں حضرت جنید بغدادی کے والہانہ انہماک اور ذوق وشوق کی ایک جھلک دیکھی، یہ مرتبہ تو بڑے بڑے زاہدوں اور

عبادت گزاروں کو بھی نصیب نہیں ہوتا، یہ ان پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل وکرم تھا، واللہ ذو الفضل العظیم۔ اس پاکیزہ نفسی اور صفائے قلب کے ذریعہ ہی خدا کا ایک مقرب بندہ اس پر قادر ہوتا ہے کہ وہ معاشرہ کی طرف توجہ کرے اور تقویٰ، اخلاق کریمہ اور انسانی اقدار کی بنیاد پر اس کی تربیت و پرداخت کرے اور اپنی پاکیزہ زندگی کے ذریعہ وہ ایک قوی الایمان، راسخ العقیدہ، باصلاحیت خوددار وغیور اور ذکی القلب نسل کو تیار کرے، اور انہیں خوبیوں کے ساتھ ایک ایسا معاشرہ وجود میں آئے، جس کے اندر صحیح دینی جذبہ کارفرما ہو، اور جس کے اندر تقویٰ وانابت الی اللہ کی روح ہر چیز پر غالب ہو، اور اسی سے ایسی قوم تیار ہوسکتی ہے جس کے سامنے تمام امتیازات ہیچ ہوں، اور یہ خصوصیت صرف اس دل کو حاصل ہو جو خدا تعالیٰ کے خوف سے لرزہ براندام ہو اور جسے اللہ تعالیٰ کے ذکر سے اطمینان وسکون نصیب ہوتا ہو۔

حضرت جنید بغدادیؒ نے پژمردہ اور بیمار دلوں کے مداوا کرنے اور فساد و بگاڑ کی اصلاح کے لئے اپنی پوری زندگی وقف کردی تھی، وہ لوگوں کی کج روی کی اصلاح کرتے اور انہیں اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی کرنے اور ہر قسم کے ذاتی مفاد اور ہوا وہوس سے بلند ہوجانے، اور اللہ تعالیٰ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑنے کی ترغیب دیتے تھے، اور ساتھ ہی گھٹیا اور ناقص رجحانات وخیالات کو ترک کرنے کی دعوت بھی دیتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے سخت جفاکشی کرکے لوگوں کی زندگی کے تاریک پہلوؤں کو روشنی وتابانی عطا کی، اور ایمان کی حلاوت، انس ومحبت کی لذت سے انہوں نے سخت سے سخت اور پتھر دل انسانوں کو بھی ریشم کی طرح نرم بنادیا، اور ایک ایسے مثالی اور آئیڈیل معاشرہ کو وجود بخشا اور ایک ایسا ماحول تیار کیا جس کی فضاؤں میں ایمان وعقیدہ کا نور رقص کناں تھا اور انہوں نے ہر اس مرض کا مداوا کیا جس نے دلوں کو زنگ آلود کردیا تھا، انہوں نے معاشرہ کے معطل و بے جان اعضاء کو اس وقت حرکت ونشاط سے بدل دیا، جب کہ لوگ زندگی کے دھارے سے ہٹ گئے تھے۔ اور انہوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ زندگی عزلت نشینی کا نام ہے، اور اس پر یقین رکھتے تھے کہ:

چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی

حضرت جنید بغدادیؒ اس غلط رجحان کو لوگوں کے دلوں سے نکالتے رہے اور انہیں تقویٰ وایمان کے زیور سے آراستہ وپیراستہ کرتے رہے، اس لئے کہ انہوں نے اپنے فہم خاص سے ایسی چیزوں کا مشاہدہ وتجربہ کرلیا تھا جس کو دوسرے لوگ نہیں دیکھ سکتے تھے انہوں نے اس بے راہ روی کے رازداروں کو پالیا تھا اس لئے انہوں نے اخلاص وتوکل اور فنائیت کی اپنی طاقت سے اس راز سربستہ کو واشگاف کیا، اس جہد مسلسل کے نتیجہ میں انہوں نے اسلامی معاشرہ کو تمام برائیوں اور فساد وبگاڑ سے پاک کیا، اور ایک مثالی اور بے نظیر معاشرہ کو وجود بخشا۔

حضرت جنید بغدادی کے ملفوظات:

حضرت سے دریافت کیا گیا کہ تقرب الی اللہ کا راستہ کیا ہے؟ فرمایا: ایسی توبہ اور ایسا تقویٰ جو عزت وسربلندی کے نشہ کو ختم کرکے عبدیت وبندگی کے لئے مجبور کردے اور ایسی آرزو جو نیک کاموں کے لئے بے چین کردے، اور دل کی گہرائیوں سے اللہ تعالیٰ کا مراقبہ، یہ چیزیں تقرب الی اللہ کا ذریعہ ہیں۔

فرمایا: زہد کا مطلب ہے جس چیز سے ہاتھ خالی ہے اس سے دل بھی خالی ہو، دنیا کو حقیر سمجھنا اور دل سے اس کا نام ونشان مٹادینا، فرمایا: خوف برے انجام سے بچاتا ہے اور خشوع دل کو عجز وبندگی کے لئے خدا تعالیٰ کی جانب راغب کرتا ہے اور انکساری وتواضع سے مراد ہے دل کا نرم اور سر کا خم ہونا۔ فرمایا کہ یقین علم کے ایسے رسوخ کو کہتے ہیں جس میں کوئی تبدیلی کا امکان نہ ہو۔ آپ نے یہ بھی فرمایا: غیب کے مقامات میں شک کا ختم ہوجانا ہے۔ فرمایا: مومن کے لئے دنیا سے آخرت کا سفر آسان ہے۔

حق کے مقابلہ میں خلق خدا سے کنارہ کش ہوجانا مشکل کام ہے، اور نفس کو خدا تعالیٰ کے سپرد کردینا اس سے دشوار گزار مرحلہ ہوتا ہے، اور خدائی احکام کے ساتھ استقامت تو جوئے شیر لانے کے برابر ہے، آپ نے فرمایا: استقامت بغیر ترش روئی کے تلخ چیز پی جانے کا نام ہے۔

فرمایا: کہ اخلاص، خدااور بندہ کے درمیان ایسا راز ہوتا ہے جسے نہ تو فرشتہ جانتا ہے جو اسے لکھ سکے، نہ شیطان جانتا ہے جو اس میں فساد کے بیج بو سکے، اور نہ ہی اس کو خواہش نفس سمجھ پاتی ہے جو اس کی جانب مائل ہو سکے۔ جب ان سے حیا کے بارے میں دریافت کیا گیا تو فرمایا:

الحیاء رؤیة التقصیر ورؤیة الآلاء تتولد منها حالة تسمی الحیاء۔

حیا نام ہے اپنی غلطیوں اور اللہ تعالیٰ کے احسانات پر نظر رکھنے کا۔ ان کے نتیجہ میں جو کیفیت انسان پر پیدا ہوتی ہے وہ حیا ہے۔

ابوعبدالرحمٰن سلمی نے فرمایا کہ میں نے اسماعیل بن جنید کو فرماتے ہوئے سنا کہ ابوالعباس بن عطاء حضرت جنید کے پاس تشریف لائے، وہ نزع کی حالت میں تھے، ابوالعباس نے انہیں سلام کیا تو انہوں نے جواب نہ دیا، تھوڑی دیر کے بعد پھر انہوں نے سلام کیا، تو فرمایا کہ مجھے معاف کرنا میں وِرد کر رہا تھا، پھر اپنے چہرہ کو قبلہ رخ کیا، تکبیر کہی اور دنیا سے رخصت ہو گئے۔

ابومحمد حریریؒ فرماتے ہیں کہ وفات کے وقت میں حضرت جنیدؒ کے سرہانے کھڑا تھا، جمعہ کا دن تھا وہ قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے، میں نے کہا ابوالقاسم! اپنے اوپر رحم کرو، فرمایا: اے ابومحمد، مجھ سے زیادہ اس وقت کوئی اس کا محتاج نہیں ہے، اس وقت ذات باری میرے صحیفۂ حیات کو لپیٹ رہی ہے۔

یہ تھی ابوالقاسم جنید بن محمد جنید کی شخصیت، جنہیں سارے جہاں نے عالم ربانی، میر کارواں اور امت اسلامیہ کا قافلہ سالار جانا اور مانا، جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوئے تو عشق ومحبت اور سلوک ومعرفت کا پرچم بلند کئے ہوئے تھے، انہوں نے اپنی زندگی کو محض ذات باری تعالیٰ کے ساتھ مربوط کر لیا تھا، اور ان کا سر محض اسی ذات کے آگے خم ہوتا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو سربلندی عطا کی اور ان کو ایسی مقبولیت اور دوام بخشا کہ وہ ہمیشہ کے لئے اللہ کے نیک بندوں اور صالحین ومقربین میں شامل ہو گئے۔

ہم کو ان کی زندگی کے ان حقائق سے سبق لینا چاہئے اور اپنے لئے عبرت کا سامان فراہم کرنا چاہئے اور مذکورہ صفات کی روشنی میں ان کے مقام و مرتبہ کا تعین کرنا چاہئے، اس طرح ہم ان کے توسط سے تقرب الی اللہ کی لذت سے فیضیاب ہو سکتے ہیں۔ اور اپنی ذات کو اس کی محبت میں سمو دینے کی حلاوت محسوس کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم کو ان کے نقوشِ راہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے
کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

خواجہ مخدوم بہاری

شیخ شرف الدین یحیٰ منیریؒ

(۶۶۱ھ-۷۸۲ء)

شعبان ۶۶۱ھ کے اواخر میں منیر کے چھوٹے سے قصبہ میں ایک عظیم ہستی نے جنم لیا۔ جس کا شمار آگے چل کر تاریخ کی اہم ترین شخصیتوں میں ہوا۔ علم وتقویٰ میں نابغۂ روزگار، اپنی استعداد وصلاحیت میں یگانہ ویکتا اور علم دین کی بے لوث خدمت کے باب میں یگانہ ومنفرد یہ شخصیت عارف باللہ شیخ احمد شرف الدین یحیٰ منیری کے نام سے معروف ہے، ان کے اندر بلند ہمتی، طلب صادق اور محبت وحلم جیسی بیشمار ممتاز صفات بیک وقت جمع تھیں، ان کی تربیت زندگی کی ٹھوس بنیادوں، علم کی اعلیٰ قدروں اور کائنات ومخلوق کے وسیع فکر وتخیل پر ہوئی تھی۔

انہوں نے بچپن ہی سے علم ومعرفت کی ٹھوس استعداد کے حصول کی جانب پیش قدمی شروع کردی تھی، اور کام وہ اتنے انہماک سے کرتے تھے کہ دیگر اداروں اور دانشوروں میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اور نہ ریسرچ وتحقیق کی دنیا میں ان کی جیسی گہرائی وگیرائی اور علمی شغف دکھائی پڑتا ہے، جب وہ مدرسہ میں داخل ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ طلبہ حسب رواج کتاب کے متن اور کلمات کو زبان زد کررہے ہیں۔ اسی میں وہ اپنی جملہ توانائیوں، صلاحیتوں اور ذہانتوں کو صرف کررہے ہیں، اور ان کا سارا وقت اسی مصرف بے جا میں استعمال ہورہا ہے، انہوں نے اس پہلو پر سنجیدگی سے غور کیا اور اس تعلیمی نہج پر ناقدانہ

نظر ڈالی۔اور ذہانت کے اس بے محل استعمال پر سخت افسوس کا اظہار کیا، وہ جانتے تھے کہ ان صلاحیتوں کو قرآن مجید کے حفظ میں صرف کیا جائے اور ساری تگ وتاز صرف اسی کے لئے کی جائے۔

ان کا سلسلہ نسب زبیر بن عبدالمطلب ہاشمی قریشی سے جا کر ملتا ہے، ان کے جد اعلیٰ شیخ محمد تاج فقیہ اپنے زمانے کے سربرآوردہ علماء مشائخ میں شمار کئے جاتے تھے، انہوں نے شہر خلیل (جو اس وقت شام میں تھا اور اب اردن میں ہے) سے ترک وطن کر کے ہندستان میں سکونت اختیار کی، اور میر نامی ایک گاؤں میں پڑاؤ ڈالا جو ساتویں صدی ہجری میں سلطان شہاب الدین غوری کے عہد کے صوبہ بہار کے دارالسلطنت کے قریب تھا۔

گاؤں کے مکتب میں جب ان کی تعلیم ختم ہوگئی تو اگلی منزل کی تلاش شروع ہوئی اسی دوران حسن اتفاق سے میدان علم وعمل کے ایک یکتائے روزگار عالم کا اس گاؤں سے گذر ہوا، یہ شیخ شرف الدین ابوتوامہ تھے جو اس وقت کے علماء مشائخ میں شمار کئے جاتے تھے، شیخ احمد شرف الدین نے ان سے ملاقات کی اور ان کے ساتھ چند لمحے گزارے، اس ملاقات سے شیخ شرف الدین کے سامنے ان کا فضل وکمال اور علم کی گہرائی وگیرائی واشگاف ہوگئی، اور اس عالم خدا ترس بزرگ سے مل کر شیخ شرف الدین کے دل میں ایک عجیب کیفیت اور تأثر پیدا ہوا، انہوں نے طے کیا کہ ان سے استفادہ کرنا اور ان کی صحبت میں دینی علوم کی تکمیل کرنا از حد ضروری ہے، ان کے والدین نے شیخ شرف الدین کو علوم دینیہ کی تکمیل اور ان سے استفادہ کے لئے اجازت بھی دیدی۔

شیخ احمد شرف الدین نے جب استاذ سے دینی علوم کی تکمیل کی اجازت چاہی تو انہوں نے کشادہ قلبی کے ساتھ اس کو منظور کیا، جب شیخ نے اپنے استاد کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنا شروع کیا تو ان کے سامنے شیخ ابوتوامہ کے فضل وکمال اور علم ومعرفت کی حقیقت روشن ہوگئی اور انہوں نے تسلیم کرلیا کہ وہ علم ظاہر کے ساتھ ساتھ یکساں طور پر علم باطن پر بھی عبور رکھتے ہیں۔ان کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ:

''شیخ شرف الدین ابوتوامہ بہت بڑے عالم اور علم کے بحر ناپیدا کنار تھے، اور پورے ہندوستان میں مرجعِ کل کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس زمانے کے علماء ومشائخ میں ان کے پائے کا کوئی عالم نہ تھا۔''

طالب علمی کے اس سنہرے موقع کو وہ خدا تعالیٰ کی جانب سے بڑی نعمت سمجھتے تھے، اور اس کی قدر کرتے تھے، اس لئے استفادہ کے بغیر ایک لمحہ بھی ضائع نہیں ہونے دینا چاہتے تھے، ان کے علمی انہماک اور ذاتی شرف کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ انہوں نے کبھی بھی عام دسترخوان پر کھانا تناول نہیں فرمایا، اس لئے کہ وہاں وقت بہت صرف ہوتا تھا، وہ اس طرح وقت کو بچا کر اس کو ریاضت ومجاہدہ میں استعمال کرلیا کرتے تھے۔

ایک مؤرخ کی شہادت ہے کہ خواجہ مخدوم بہاری دور طالب علمی میں گھر سے آنے والے سارے خطوط ایک تھیلی میں ڈال دیا کرتے تھے، ان کو پڑھتے نہیں تھے، تاکہ ان خطوط کے مندرجات سے ان کی طبیعت میں انتشار وبے چینی نہ پیدا ہو، جب انہوں نے تکمیل علم کے بعد ان خطوط کو پڑھنا شروع کیا تو وہ کبھی کسی رنج والم کی خبر پر رو دیتے تو کبھی کسی خوش کن بات پر مسرت کا اظہار کرتے، علوم کی تکمیل کے بعد انہوں نے اہل خاندان سے ملاقات کے لئے وطن واپسی کی نیت کی، اور استاد سے اجازت طلب کی، لیکن شیخ نے علم وتقویٰ کی دولت کے باوجود کسی ظاہری قرابت کے بغیر انہیں رخصت کرنا پسند نہیں کیا، اس لئے اپنی بیٹی کو ان کے عقد میں دے کر اپنی اس آرزو کی تکمیل کی، جن سے بعد میں ان کے انتہائی ذہین صاحبزادے شیخ ذکی الدین تولد ہوئے، علم وعمل کے اس مرتبہ پر پہونچ جانے کے باوجود ابھی شیخ شرف الدین کی علمی تشنگی برقرار تھی، اور ابھی ان ظاہری علوم سے وہ آسودہ نہیں ہوئے تھے، اس لئے مزید استفادہ کی پیاس انہیں پریشان کرتی رہی اور ان کی بلند ہمتی، دوراندیشی، طلب صادق اور عشق خداوندی نے ان کو کسی بھی طرح اس کی اجازت نہ دی کہ وہ اتنے ہی علم پر قانع ہوجائیں اور اپنے زمانہ کے علماء کی طرح کسی گوشہ میں درس

وتدریس کی محفل جمالیں چنانچہ اس مقصد کی خاطر انہوں نے اس دور میں علم وعلماء کے مرکز اور روحانیت کے سرچشمۂ فیض دہلی کا سفر کیا، اور دہلی میں ان کی ملاقات محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاء سے ہوئی حضرت نظام الدین اولیاء نے ان کا خیر مقدم کیا، دونوں کے درمیان بعض علمی موضوعات پر گفتگو رہی، اس گفتگو سے شیخ نظام الدین کو ان کی علمی گہرائی ووسعت کا اندازہ ہوگیا، اس لئے انہوں نے کہا کہ میری بدنصیبی ہے کہ میں آپ کی تربیت سے قاصر ہوں، آپ کا مقام تو بہت بلند ہے۔ شیخ شرف الدین وہاں سے پانی پت پہونچے، اور وہاں بوعلی قلندر پانی پتی کی خدمت میں حاضر ہوئے، لیکن شیخ کے مغلوب الحال ہونے کی وجہ سے وہاں بھی وہ گوہر مراد حاصل نہ کرسکے اور بیعت کے سلسلہ میں ان کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

اس ناکامی سے شیخ یاس وناامیدی کا شکار ہوگئے کہ کسی باکمال راہ نما تک ان کی رسائی ممکن نہیں ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک دوسرے شیخ کی خدمت میں پہنچادیا، جو سلوک ومعرفت کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے، یہ شیخ نجیب الدین فردوسی کی شخصیت تھی، یہاں پہونچ کر شیخ شرف الدین کی پیاس بجھی اور ان کی دیرینہ آرزو پوری ہوئی، انہوں نے شیخ کے دست حق پرست پر بیعت کرلی۔ اور اسی وقت شیخ شرف الدین کو انہوں نے اجازت بیعت عطا فرمادی۔ اور ایک کاغذ پر سند اجازت لکھدی، شیخ شرف الدین کو اس پر بڑا تعجب ہوا، انہوں نے کہا کہ نہ ہی میں آپ کے پاس وقت گزار سکا اور نہ ہی سلوک وارشاد کے مراحل طے ہوئے۔ اتنی بڑی ذمہ داری کا بارگراں میں کیسے اٹھا سکوں گا؟ شیخ نجیب الدین نے صرف اتنا جواب دیا کہ یہ جو کچھ ہوا ہے وہ ایک غیبی اشارے کے تحت ہوا، اس میں میرا کوئی دخل نہیں ہے۔

شیخ احمد شرف الدین وہاں سے عجیب احوال وکیفیات کے ساتھ واپس ہوئے، عشق ومحبت اور ایمان ویقین کی سوزش ان کے دل میں گھر کرچکی تھی اور صورتحال یہ تھی کہ ان کو کسی پل چین نہ آتا تھا یہ ایک ولولہ اور سرمستی تھی جو شیخ نجیب الدین نے انہیں

ایک غیبی اشارے سے عطا کی تھی، شیخ کہتے ہیں کہ شیخ نجیب الدین فردوسی کے ساتھ پہلی ملاقات سے ہی مجھ پر عشق وللّٰہیت کا وجد طاری ہوگیا اور عشق کی تپش اور چنگاری میرے دل میں سوزش پیدا کرنے لگی اور اس میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا گیا۔

وطن سے واپسی پر ان کا ایک جنگل سے گذر ہوا وہاں انہوں نے طاؤس کی آوازیں سنیں، اس آواز سے وہ بے چین ہوگئے، ان کے صبر کا پیمانہ چھلکنے لگا اور خلوت وعزلت کی آرزو نے وہیں ڈیرا ڈالنے پر مجبور کردیا۔ اس لئے وہ لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئے۔ لوگوں نے ان کو بہت تلاش کیا لیکن سوائے ناامیدی کے کچھ ہاتھ نہ لگا۔ اور شیخ شرف الدین دنیا ومافیہا سے بے پروا لوگوں کی نگاہوں سے دور اسی جنگل میں زندگی بسر کرتے رہے، خلوت وعزلت کی یہ زندگی گذارتے ایک طویل مدت گزر گئی، اس دوران وہ وہاں ریاضت ومجاہدہ کرتے اور جاہ ومال سے بے نیاز ہوکر محبوب کے عشق میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتے رہے، اس چیز نے ان کو ایسے بلند مرتبہ پر پہونچا دیا جو تصوف وسلوک، تقرب الی اللہ، دنیا سے بے نیازی اور آخرت طلبی کی بڑی عظیم منزل ہے۔ اس بلند مقامی کے باوجود وہ دشوار گزار مجاہدے کرتے رہے اور اپنے آپ کو حقیر سمجھتے رہے، ایک موقع پر انہوں نے فرمایا: کہ جو ریاضت ومجاہدہ میں نے کئے اگر پہاڑ ان کو ادا کرے تو ان کی شدت سے ریزہ ریزہ ہوجائے لیکن شیخ شرف الدین کو کچھ نہ ہوا، ان کی نمایاں خصوصیات وامتیازات جو ان کی فطرت ثانیہ بن چکی تھیں وہ خدا اور رسول کے لئے ان کی فنائیت اور اپنے کو ہیچ سمجھنا ہے اور بلاشبہ یہ بلند مقامی شیخ کے مشقت سے بھرپور ریاضت ومجاہدے کی برکت ہے۔ ایک موقعہ پر انہوں نے اپنی آرزو کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

''میری آرزو یہ ہے کہ نہ اس دنیا میں میرا نام ونشان رہے اور نہ آخرت میں، اور کہتے ہیں کہ مستقل شیطان میرے ساتھ کھلواڑ کرتا رہا اور مجھے لالچ دیتا رہا یہاں تک کہ نہ میں خود کو پہچان سکا اور نہ اپنے اندر میں نے اسلام کا کوئی نشان پایا۔''

اپنے اعزاء ومریدین کے نام ایک مکتوب میں اپنے حال زار پر نوحہ وماتم

. کرتے ہوئے اور اپنی حالت وکیفیت کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''عارفین کا قول ہے کہ خدا کی قسم، پھر خدا کی قسم، خداوند تعالیٰ کو اس سے زیادہ کوئی چیز محبوب نہیں کہ بندہ خود اپنی بدحالی کا خیال کر کے رو پڑے۔ پس چاہئے کہ آج اس راہ کے صدیق اور دین کے پیشوا یہ ماتم خوانی خواجہ اویس قرنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سیکھیں، اے بھائی! جو کوئی ہر لحہ اپنے آپ پر ماتم اور آہ وفغاں نہیں کرتا وہ ایک مدعی ہے جو قیامت سے غافل ہے وہ ایک مردار ہے جس کا دل حسرتوں سے بھرا ہوا ہے، یہ کیا جھوٹی خواہشات ہیں کہ آج ہر سر میں ان کا سودا ہے۔ ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ دنیاوی جاہ وجلال ہونا چاہئے اور ہمارے حکام کے امر ونہی کا نفاذ ہونا چاہئے اور دنیا کی ناز ونعمت ہونی چاہئے اور عزت اور اس کا ہمیشہ اظہار ہونا چاہئے اور پھر اس سب کے ساتھ خداوند تعالیٰ کے ساتھ آشنائی بھی ہونی چاہئے، خدا کی قسم یہ ناممکن ہے۔

جاں باز کہ وصل او بدستاں ندہند
شیراز مدح شرح بمستاں ندہند
آن جا کہ بہم می ہمہ مرداں نوشتند
یک جرعہ ازاں بخود پرستاں ندہند

وہ بلند مقام جس پر شیخ شرف الدین فائز ہوئے وہ انہیں حد درجہ افادۂ خلق کے صلہ میں عطا ہوا تھا، انہوں نے لوگوں کو خدا کا راستہ دکھایا اور راہ راست کی جانب رہ نمائی کی، ان کی روحانی تربیت کے نتیجہ میں جو لوگ کمال ومعرفت کے بلند مقامات تک پہونچے ایسے ارادت مندوں کی تعداد تین سو سے زائد ہے۔

ان کی صاف ستھری گفتگو اور ان کی عام مجلسی تقریروں کا شمار اصلاح وتربیت کے اصول ومبادی میں ہوتا ہے، یہ ارشادات بڑی نکتہ رسی، زندگی، کائنات اور انسان کے بارے میں اعلیٰ مفاہیم پر مشتمل ہوا کرتے تھے۔ اپنے مریدین وسالکین کے نام ان کے خطوط ومکتوبات سلوک وتصوف کے ایسے حقائق اور نکات پر مشتمل ہوتے تھے جن کو پڑھ کر عقل انسانی دنگ رہ جاتی ہے۔ انہوں نے یہ خطوط بعض اعیان مملکت کے پاس بھیجے تھے۔

خصوصاً قاضی شمس الدین حاکم قصبہ چوسہ کے نام ان کے مکاتیب کا جو مجموعہ ہے یہ مکاتیب ان کے زور قلم، بلند علوم، وفورِ علم اور غور و مطالعہ کا نتیجہ ہیں ساتھ ہی یہ خطوط قوت بیان، حسن انشا، اور نغمگی کا بھی اعلیٰ نمونہ ہیں۔ یہ مکتوبات ہمیشہ اسلامی لٹریچر کے وسیع ذخیرہ میں روشنی وتابانی کا باعث اور دینی وادبی علوم کے لئے زینت بنے رہیں گے، اور زمانہ کی گردان کو کبھی بھی کہنہ نہ ہونے دے گی۔ اور ان کا چشمہ فیض کبھی خشک نہیں ہوگا۔

ان رسائل پر ایک نظر ڈالنے سے ان کی اصل روح کا پتہ چل جاتا ہے، اور ان خطوط کے اندر محبت و معرفت اور اخلاص وللّٰہیت کا جو جذبہ کارفرما نظر آتا ہے دوسرے لوگوں کے یہاں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ اس جذبہ نے ان خطوط میں ایک زور پیدا کر دیا ہے اس لئے ان مکاتب کو پڑھنے والے کا دل کیف وسرور سے لبریز ہو جاتا ہے اور بلند حقائق کا ادراک اور روحانی معارف کی فراوانی اس کے اندر وجد وسرور پیدا کر دیتی ہے۔ اور اس آئینہ میں اسے دنیا کی گمراہی اور اس کی کوتاہ عمری کا پتہ چلتا ہے، اور دنیا کی بے ثباتی اور اس کے سراب و بے حقیقت ہونے کی حقیقت واشگاف ہوتی ہے، جس سے عموماً نگاہیں دھوکہ میں پڑ جایا کرتی ہیں۔

ان خطوط کو پڑھ کر اس زمانے کے اولیاء و عارفین کی عظمت کا پتہ چلتا ہے اور ان کے مطالعہ سے زندگی کے ان حقائق کا مزہ ملتا ہے جنہیں اولیاء و عارفین نے سمجھا، اور وہ لوگ اسی رنگ میں رنگ گئے، یہ وہ لوگ ہیں جو صبر و توکل، عشق و محبت اور ایمان و ایقان کے ذریعہ زمین کی پستی سے آسمان کی بلندی پر پہونچ گئے اور انہوں نے زندگی کی تاریکیوں سے نکل کر انہیں حقائق کے ذریعہ حسن اخلاق اور نورانیت کے سرچشموں کو حاصل کر لیا۔ میں ان عارفین کو روشنی کا مینار کہتا ہوں، اس لئے کہ درحقیقت یہ عارفین علم و حکمت کی خاطر نور کے سرچشموں سے سیری حاصل کرتے ہیں اور یہ دل ہی تو ہے جب یہ کدورتوں اور نفرتوں سے پاکیزہ ہو جائے اور روحانیت کا اس میں ظہور ہونے لگے تو انسان فرشتہ صفت ہو جاتا ہے اور اس کا مقام تمام مخلوقات سے بلند ہو جاتا ہے۔ یہ دل وہی گوشت کا ایک لوتھڑا ہے جو روشن

ومنور ہوتا ہے تو وہ شرافت ومروت، حسن اخلاق حکمت وعزیمت اور سرگرمی وسرفروشی کا مرکز ومنبع بن جاتا ہے، اور جس کو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے نواز دے تو گویا اس کو سارا جہاں مل گیا۔

خدا کی قسم یہ حکمت وعلم، نور وبرہان اور ایمان واخلاص ہی ہیں جو ایک عارف کے دل کو منور کئے ہوئے ہیں، چنانچہ جو شخص ان مدارج پر پہونچ جائے اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ سے عشق کرتا ہے، اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی طاقت وقوت عطا ہوتی ہے کہ جب وہ کسی قوم کی اصلاح کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے تو خدا کے حکم سے وہ ان کے اصل امراض کی تشخیص کر کے ان کے بیمار دلوں کو شفایاب کرتا ہے، اور پراگندہ عقل وشعور کو محض خدا کے دامن سے وابستہ کر دیتا ہے ان میں ہوا وہوس کا گذر بھی محال ہو جاتا ہے راہِ سلوک ومعرفت کے یہی مسافر ہوتے ہیں جو عظیم ترین کارناموں کو سرانجام دیتے ہیں اور جن کے بوجھ کو بڑے بڑے طاقت ور اور باعزم لوگ اٹھانے سے قاصر ہوتے ہیں لیکن یہ عارفین اور پاکباز بندے کسی تعاون اور دستگیری کے بغیر تن تنہا عظیم کارناموں کو انجام دے ڈالتے ہیں اور یہی کارنامے ان کے لئے باعث فخر وامتیاز بن جاتے ہیں اور ان کے گہرے نقوش تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ ہمیش کے لئے ثبت ہو جاتے ہیں اور ان کے نقش پا کو سنگ میل بنا کر لوگ زندگی گزارتے ہیں اور ہر دور اور ہر مقام پر اس کی صدائے بازگشت کو سنا جا سکتا ہے۔ خواجہ کے یہ مکاتیب کسی ایک موضوع یا کسی ایک نکتہ پر مرکوز نہیں ہیں بلکہ ان کے اندر تلاطم خیز زندگی کے ہر زندہ موضوع پر رہنمائی موجود ہے۔

یہ مکتوبات فطرت انسانی کے حقائق سے بحث کرتے ہیں ان میں الجھی ہوئی گرہوں کو کھولنے، کجی کو دور کرنے اور لوگوں کے ذہن ودماغ میں پیدا ہونے والے مسائل کا حل پوشیدہ ہے۔ مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اپنی مشہور کتاب تاریخ دعوت وعزیمت میں ان خطوط پر تبصرہ کرتے ہوئے، اور ان کے معنی ومفاہیم کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''حضرت شیخ شرف الدین یحیٰ منیریؒ کے مکتوبات کے مطالعہ سے

پڑھنے والے کو صاف احساس ہوتا ہے کہ یہ بلند علوم، یہ نادر نکات اور تحقیقات لکھنے والے کی صرف ذہانت، وفورِ علم اور غور و مطالعہ کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ اس کے ذاتی تجربات اور اس کے ذوق و یقین کا نتیجہ ہیں۔ خدا کے علوئے بارگاہ، شان بے نیازی، اس کی داوری و کبریائی، جلال و جمال، مومن کے خوف و رجا، عارفین و واصلین بارگاہ کے ناز و گداز، سرور و اندوہ، دریائے رحمت کی طغیانی، توبہ و انابت الی اللہ کی ضرورت پر جو لکھا گیا ہے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کوئی محرم راز آشنائے حقیقت لکھ رہا ہے۔''

اسی طرح مرتبۂ انسانیت کی رفعت و بلندی، قلب انسان کی عظمت و وسعت، محبت کی قدر و قیمت، انسان کی بلند پروازی، دور رسی، مشکل پسندی اور عنقا طلبی، علو ہمیت اور قوت طلب کے متعلق جو طاقت ور مکتوبات لکھے گئے ہیں وہ اعلیٰ ترین تحریروں میں شامل ہونے کے قابل ہیں۔'' (تاریخ دعوت و عزیمت ص ۲۴۷ جلد سوم)

ذیل میں ان کے بعض مکتوبات کے نمونے پیش کئے جاتے ہیں، ان مکتوبات سے ان کی قدر و قیمت، تاثیر و قوت اور اثر پذیری کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ اپنے ایک رسالہ میں شہنشاہ مطلق کی بے نیازی کو بیان کرتے ہیں:

''کہ کسی کو اس سے چون و چرا کی گنجائش اور یارائے سوال نہیں۔ لایسأل عما یفعل وھم یسئلون۔ وہ جس کو چاہے دولت ایمان اور خلعت قبول سے نوازے اور جس کو چاہے راندۂ درگاہ اور مطرود بارگاہ بنادے، جس کو چاہے خاک سے افلاک پر پہونچادے اور جس کو چاہے افلاک سے خاک پر گرادے۔''

''کس کی مجال ہے کہ خدا سے یہ کہہ سکے کہ کیوں فلاں کو یہ دولت دی، فلاں کو نہیں دی، جیسے کہ ایک بادشاہ ایک کو منصب وزارت سے سرفراز کرتا ہے دوسرے کو دربانی و کناسی پر مقرر کرتا ہے، اسی طرح جب وہ دین کی دولت عطا فرماتا ہے تو کبھی اس کو خرافات سے اٹھالاتا ہے کبھی بے حیثیت لوگوں، خاکروبوں، ظالموں اور حرام خوروں کے گروہ سے نکال لاتا ہے، کس کا جگر ہے کہ کہے، أھؤلاء من اللہ علیھم من بیننا (کیا اللہ کو ہمارے درمیان انہیں پر احسان کرنا تھا) حکم ہوتا ہے کہ فضیل بن عیاض کو گرچہ وہ راہزن ہے، لاؤ وہ ہمیں مطلوب ہے، بلعم باعور کو جو سات لاکھ برس

تک مصلّی سے نہیں ہٹا۔ ہماری درگاہ سے باہر لے جاؤ کہ وہ ہمارے یہاں کا نکالا ہوا ہے، ہم عمر کو جو بت پرستی میں مشغول ہے چاہتے ہیں، عزازیل کو جو سات ہزار سال سے عبادت میں مشغول ہے نہیں چاہتے ہیں۔ کس کی مجال ہے کہ کہے، کیوں؟

گرگ از رمہ بروآنچہ مراد دل او بود

گو بادیہ پیمائی ہمی مرد شبانرا

اگر مہربانی کی نظر ڈالے تو ہمارے سب عیب ہنر ہیں، ہمارے تمام نقص باکمال، اور ہماری بدزیبی حسن و جمال، اے برادر ایک مٹھی بھر خاک تھی۔ جو ذلت وخواری کی حالت میں راستہ میں پڑی اور پاؤں کے نیچے آرہی تھی، لطف ونوازش کی ایک نظر پڑی اور صدا آئی، انی جاعل فی الارض خلیفة۔

ایک دوسرے مکتوب میں اس شان بے نیازی کو دوسرے اسلوب میں بیان کرتے ہیں:

''چشم عبرت کھولو، آدم کی حسرت، نوح کی فریاد سنو، ابراہیم خلیل اللہ کی درماندگی اور یعقوب پیغمبر کی مصیبت کی داستان پر کان دھرو کنویں میں یوسف ماہ رو کو دیکھو، حضرت زکریاؑ کے سر پر آرا اور حضرت یحییٰ کی گردن پر تلوار ملاحظہ کرو۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سوزش جگر و بیتابی دل پر غور کرو اور پڑھو، کل شئی هالك الا وجهه''۔

ایک خط شیخ قاضی شمس الدین کو مخاطب کرتے ہوئے اس طرح شروع کرتے ہیں:

''میرے بھائی راستہ غیر محفوظ ہے، منزل دور، محبوب و مطلوب نامتناہی، جسم ضعیف، دل بے چارا، جان عاشق، سر مشتاق، شاعر کہتا ہے۔

جز جان وجگر نیست شکار خور تو

زانست کہ ہر سرے ندارد سر تو

کتنے خرمن طاعت ہیں جو نزع کے وقت وقدمنا الی ما عملوا من عمل فجعلنٰه هباء امنثورآ۔ کی بے نیازی کی آندھی کی نذر ہو جاتے ہیں، اور کتنے آباد سینے ہیں جن کو سکرات موت میں وبدا لهم من الله مالم یکونوا یحتسبون، کافرمان سلطانی ویران کر دیتا ہے۔ کتنے چہرے ہیں جن کو لحد میں قبلہ سے پھیر دیتے ہیں، کتنے آشنا ہیں جن کو پہلی ہی شب میں بیگانہ کہہ دیتے ہیں، کتنے ہیں جن

سے کہا جاتا ہے نم کنومة العروس اور دوسرے سے ارشاد ہوتا ہے۔ نم کنومة المنحوس کبھی ایسا رد کرتے ہیں جو کسی طاعت پر بھی واپس نہیں لیتے۔ شعر

من لم یکن للوصال اھلا فکل احسانه ذنوب

اور کبھی ایسا قبول کرتے ہیں کہ پھر کسی معصیت کی پروا نہیں کرتے۔

فی وجهه شافع یمحوا سائئته من القلوب ویأتی بالمعاذیر

خلیل اللہ کو بت خانہ سے نکلتا ہوا دیکھو اور یخرج الحی من المیت پڑھو، کنعان کو نوحؑ کے گھر سے باہر آتا ہوا دیکھو اور یخرج الحی من المیت کو یاد کرو۔ آدم کے نقش کو ایسا دوام بخشا کہ لغزش کا نقصان بھی اس کو مٹا نہ سکا، ابلیس کو حرف غلط کی طرح ایسا مٹایا کہ بڑی طاعتوں کے حق نے بھی اس کو کچھ فائدہ نہ پہونچایا، جس طرح کسی کے لئے لہم البشریٰ کی بشارت ہے، اسی طرح راندگان درگاہ کے لئے لا بشریٰ یومئذ للمجرمین کا اعلان بھی، جیسے کہیں سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود ہے ایسے ہی یعرف المجرمون بسیماھم، بھی، شاعر نے ٹھیک کہا:

غافل منشیں زخویش چوں بیخبرے
حاصل کن ازیں جہاں فانی ہنرے
خود بنشیند غبار وشک برخیزد
کاسپ است بریر رانت یا لاشہ خبرے

اس طرح وہ متنوع اور موثر اسلوب میں اپنے مریدین و متبعین کے اندر حرکت و حرارت اور نشاط و زندگی کی روح پھونکتے تھے اور معرفت نفس، خدا و بندے اور خالق و مخلوق کے درمیان ربط و تعلق کو مستحکم بنا دیتے تھے۔ یہ تمام رسائل زیادہ تر پرزور و پر اثر زندہ و پائندہ مضامین سے لبریز ہیں۔ ان مکتوبات کا قاری اپنے دل کے دروازوں کو تقویٰ و ایمان کے بلند مفاہیم کے لئے کھلا ہوا پائے گا۔ یہ مفاہیم اس کے دل کو خالق کائنات سے جوڑنے اور نفس کو ایسے بلند و بالا مقام تک پہونچانے میں معاون ہوں گے۔ جن کے آگے مزید بلندی کی حدیں تمام ہو جاتی ہیں۔

اگر ہم اس موضوع کو یہیں نہ چھوڑیں تو بات سے بات نکلتی رہے اور قصہ طویل ہو جائے، اس لئے اب ہم اسی پر بس کرتے ہیں اور خواہش کرتے ہیں کہ قاری درد دل کے ساتھ لکھے گئے ان مکتوبات کے الفاظ پر غور وخوض کرے کہ ان مکتوبات میں ایسی پرسکون زندگی گزارنے کا نسخہ موجود ہے جسے اپنا کر اہل دل سکون واطمینان کی زندگی بسر کیا کرتے ہیں، اور یہ چیز ان کو اللہ تعالیٰ سے اپنے روابط مضبوط کرنے، اس کی حکمت ودانائی کے گہرے علم اور اس کی قدرت وکبریائی پر ایمان کامل کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے، اس طرح یہی چیز معاشرہ کے اندر پھیلی ہوئی گمراہیوں کی اصلاح اور پوری دنیا میں اسلام وسلامتی کی جوت جگانے اور بے چین دلوں میں چین وسکون بھرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ بالآخر ۲۶ رشوال المکرّم ۱۸۷ھ کو پوری ایک صدی تک خلق خدا کے دلوں کی اصلاح اور تزکیہ نفس کرنے کے بعد اس ہستی نے جان جان آفریں کے سپرد کر دی اور ہندستان کی اسلامی تاریخ میں اس نے اپنا نام ہمیشہ کے لئے اس طرح ثبت کر دیا کہ جو ہمیشہ اللہ والوں کے لئے یادگار رہے گا۔ اور دین وعلم کی دنیا میں روشن وتابندہ رہے گا۔ ان کے کارناموں کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ اگر آپ کی شخصیت جلوہ گر نہ ہوئی ہوتی تو دینی اور روحانی اسلامی لٹریچر میں ایک کمی محسوس کی جاتی، آپؒ کی وفات سے علم وروحانیت کی دنیا کا ایک خلا پیدا ہو گیا جسے آج تک پر نہیں کیا جاسکا۔ میر نے کہا تھا۔

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

هيهات لايأتي الزمان بمثله ۔۔۔ ان الزمان بمثله لبخيل

مزید تفصیل کے لئے:

- تاریخ دعوت وعزیمت جلد سوم
- مکتوبات صدی
- نزھۃ الخواطر

شیخ فریدالدین اجودھنی گنج شکر

(۵۶۹ھ--۶۶۴ء)

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تاتاری فتنہ عالم اسلام پر ایک عذاب و وبال کی شکل میں ٹوٹا، لیکن یہ فتنہ اپنے پہلو میں کچھ خیر بھی سموئے ہوئے تھا، اس لئے کہ یہ فتنہ بعض اہم اسلامی شخصیات کی ہندوستان ہجرت کا پیش خیمہ ثابت ہوا، ان کے یہاں آباد ہونے سے خیر وفلاح اور یہاں کے باشندوں میں ان کی روحانیت کے اثرات کا مرتب ہونا ایک بدیہی امر تھا اور اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اگر یہ دہشت ناک اور بلاخیز فتنہ رونما نہ ہوا ہوتا تو شاید یہ روحانی پیشوا ہمارے ملک میں قدم نہ رکھتے، اور نہ ہی اس کے نتیجہ میں یہاں ان کے روحانی اثرات اور اشاعت اسلام کی مساعی کے نقوش نظر آتے۔

یہ ایک امر تقدیری تھا کہ تاتاریوں نے عالم اسلام کے قلب میں تباہی وہلاکت کے رکارڈ توڑ دیئے اس کے نتیجہ میں بہت سے اللہ تعالیٰ کے نیک اور مخلص بندے ان علاقوں میں منتشر ہوگئے جہاں لوگ ہدایت خداوندی کی پیاس سے تڑپ رہے تھے۔ وہ خدائی روشنی اور نور الٰہی کے منتظر تھے، جس سے وہ اپنی زندگیوں کو روشن کرلیں۔ اور ملک وقوم میں پھیلی ہوئی تاریکی کی چادر کو ہٹا کر چپے چپے کو آراستہ وپیراستہ کردیں۔ انہیں مہاجرین میں ایک ایسی شخصیت بھی تھی جسے تاتاری فتنہ نے بے چین وپریشان کردیا تھا اور ان کی زندگی ویرانے سے بدل گئی تھی، یہ شخصیت قاضی شعیب بن احمد بن یوسف کی تھی، جو شیخ فرید الدین مسعود کے دادا تھے، وہ کابل سے اپنے اہل وعیال کے ساتھ ترک وطن کرکے لاہور

میں سکونت پذیر ہوگئے، اور موجودہ پاکستان میں واقع ملتان کے کھنوال شہر میں منصب قضا پر فائز ہوئے۔ اس شہر میں ۵۶۹ھ کو شیخ فریدالدین کی پیدائش ہوئی، اس کے بعد کم عمری ہی میں وہ ملتان چلے گئے اور اپنے زمانہ کے اہم اساتذہ سے انہوں نے حصول علم شروع کیا، ان کے نصیب نے انہیں شیخ قطب الدین بختیار سے جاملایا، شیخ نے اس فرزند کے اندر ولایت وذکاوت کے آثار دیکھ کر انہیں حصول علم پر آمادہ کیا، شیخ فریدالدین کو بھی ان سے محبت ہوگئی اس لئے انہوں نے شیخ قطب الدین سے بیعت کرلی، اور تکمیل علوم کے بغیر ہی ان کی خدمت میں پڑ جانے کی خواہش کا اظہار کیا، لیکن شیخ قطب الدین اس کے لئے رضامند نہ ہوئے اور انہیں منع کردیا۔

جب شیخ فریدالدین دینی علوم کی تکمیل کر چکے تو وہ دہلی میں اپنے شیخ قطب الدین سے ملے، انہوں نے شیخ فریدالدین کے لئے بازار کے دھوم دھڑاکے اور لوگوں کے شور وغوغہ سے دور ایسے علاقہ کو منتخب کیا جہاں رہ کر وہ سکون کے ساتھ ذکر وریاضت کرسکیں، اور کم سے کم وقت میں وہ معرفت وسلوک کی منزلیں طے کرسکیں۔ انہوں نے عملی طور پر ایسا کر دکھایا، جب شیخ نے دیکھا کہ ان کے شاگرد رشید شیخ فریدالدین تصوف وسلوک کے بلند مرتبہ پر فائز ہو چکے ہیں اور اب لوگوں کی رہ نمائی، ان کے فلاح ورشد اور اسلام کی تبلیغ واشاعت کے فریضہ کو بحسن وخوبی انجام دے سکتے ہیں تو انہوں نے ان کو خلعت خلافت سے نوازا، پھر انہیں ہانسی شہر روانہ کیا جہاں وہ اصلاح وارشاد اور درس وافادہ کی مسند پر متمکن ہوئے۔

نزہۃ الخواطر کے مصنف علامہ عبدالحی حسنیؒ اپنی کتاب میں رقم طراز ہیں:

''پھر وہ ہانسی تشریف لے گئے اور وہاں بارہ سال کا عرصہ گذارا، وہاں انہوں نے سخت ریاضت ومجاہدہ کیا، جس کے نتیجہ میں ان سے خوارق عادت امور، کرامتیں اور عجیب عجیب چیزیں ظاہر ہونے لگیں، لوگ ان پر ٹوٹ پڑے۔ ناچار انہیں اپنے مسکن کو خیرباد کہنا پڑا اور وہاں سے کنوال چلے گئے جہاں ایک زمانہ تک ان کا قیام رہا۔

کنوال میں بھی شہرت نے انہیں چین نہ لینے دیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں ان کے نام کا ڈنکا بجنے لگا، ہر چہار جانب سے لوگ جوق در جوق آنے لگے، انہیں یہ چیز نہ

بھائی اور وہاں سے بھی ترک وطن کر کے اجودھن کا رخ کیا، ان کا خیال تھا کہ یہ ایک دور افتادہ گاؤں ہے، گاؤں کے لوگوں کے اپنے مسائل ہوتے ہیں وہ ان کی وجہ سے علماء وشیوخ کی جانب رخ کرنے کا موقع نہیں پاتے، اور زیادہ تر ان کو اس کا علم بھی نہیں ہو پاتا لیکن ان کا یہ خیال درست نہ ثابت ہوا، استفادہ کا یہ سلسلہ یہاں بھی چل پڑا اور لوگ ازدحام لگانے لگے، چند ہی دنوں میں لوگوں کی آمد میں اس قدر اضافہ ہونے لگا کہ دیر رات تک زائرین کا سلسلہ ختم ہونے کا نام نہ لیتا تھا اور آدھی رات تک دروازہ کھلا رہتا تھا۔"

اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے افادہ، اصلاحِ نفس وتزکیۂ قلوب کا خیال شیخ فرید الدین کے دل میں ڈالا چنانچہ ان کا دل اس کے لئے تڑپ اٹھا، انہوں نے معاشرہ کے امراض اور دل کے روگوں کی تشخیص شروع کی اور لوگوں کے حالات ومسائل زندگی کا دقیقہ رسی کے ساتھ جائزہ لینا شروع کیا، وہ اس نتیجہ پر پہونچے کہ لوگ اسلامی تعلیمات کے پیاسے ہیں وہ دینی علوم واخلاق کے ضرورت مند ہیں اور انہیں بس صحیح دستور حیات اور بہتر نظام زندگی کی تلاش ہے۔

شیخ فرید الدین نے اس بارگراں کو اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھالیا اور لوگوں سے ایمان وفنائیت فی اللہ کا عہد لینے لگے، اس کے نتیجہ میں لوگوں کی توجہ ان کی جانب مسلسل بڑھتی گئی اور اطراف واکناف کے لوگ بیعت کے لئے آنے لگے، لوگوں نے ان سے علم باطن اور تزکیہ نفس کے باب میں خوب خوب فائدہ اٹھایا اور اس سے ایک صالح اسلامی معاشرہ کی تشکیل میں بڑی مدد ملی اور جاہلانہ برائیوں گمراہیوں اور شرک وبت پرستی کی اصلاح ہوئی جو اس زمانے میں خاص طور سے مسلمانوں کے اندر سرایت کر چکی تھی۔

یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ شیخ فرید الدین کا شمار اس وقت سلسلۂ چشتیہ کے مجددوں میں ہوتا ہے جس کی بنیاد شیخ معین الدین سجزی نے چھٹی صدی ہجری میں رکھی تھی۔

انہوں نے ایمان کی اس کھیتی کو اپنی پرزور روحانیت اور وسیع خلوتوں کے سرچشمہ سے لالہ زار بنادیا اور اس کو ان کے الٰہی وربانی علوم میں علو مرتبہ نے جلا بخشی جو بندہ کو اپنے رب سے ملاتی ہے۔ اور انسانی زندگی کو خدائی ربط وتعلق کی شہ رگ سے مربوط کرتی

ہے۔ان کی دعوت نے لوگوں کے دلوں میں زبردست اثر پیدا کردیا، انہوں نے مردہ دلوں میں زندگی کی روح پھونک دی، اوران کے اندر ایمان ویقین کے شعلے بھڑکائے ہندوستان میں ایمانی اثرات کے زور سے دعوت اسلامی کا چمنستان لہلہا اٹھا اور خدا کے حکم سے یہ درخت بارآور ہوا۔ اسلامی مصلحین اور داعیوں کی ایک ایسی جماعت تیار ہوگئی جو ہندستان میں اسلامی بیداری کی اساس قرار پائی، انہیں کی مساعی وجاں فروشی سے ہندوستان میں اسلام کی دعوت برگ وبار لائی اوراس نے ملک میں ایک نمایاں مقام حاصل کرلیا اگران کی یہ مساعی، قربانیاں اور سرفروشیاں نہ ہوتیں تو اس کفرستان میں اسلام اتنی بہتر حالت میں نظر نہ آتا جب کہ اس وقت یہاں اسلام برائے نام باقی رہ گیا تھا اوراکثر عبادت گاہیں اور دانش گاہیں آثار قدیمہ، میوزیم وعجائب خانوں میں تبدیل ہوچکی تھیں جو محض سیاحوں کی تفریح طبع کا ذریعہ ہوا کرتی تھیں اور دلوں میں ان کی قدر ومنزلت باقی نہ رہی تھی۔

شیخ فریدالدین کی پوری زندگی فقر واستغناء، زہد وقناعت اور ریاضت ومجاہدہ سے عبارت تھی، یہ زندگی ہر داعی کو کہاں نصیب ہوتی ہے، یہ ایک خوشگوار مثالی زندگی تھی جس سے اس دنیا میں جنت کی ہواؤں کے جھونکے محسوس ہونے لگے اور ہمہ وقت فیض خداوندی کا نزول ہونے لگا۔

معروف سوانح نگار شیخ محمد مبارک علوی اپنی کتاب ''سیر الاولیاء'' میں رقم کرتے ہیں:

''وہ پیلو کے پھل کو ایک دیگچی میں ابال لیتے تھے اس کو خود کھاتے اور فقراء ومساکین میں تقسیم کردیا کرتے تھے، ایک دن کہیں سے کھانا آیا وہ روزے سے تھے، جیسے ہی انہوں نے منہ میں لقمہ رکھنے کا ارادہ کیا تو اچانک رک گئے اور فرمایا کہ اس کھانے میں کوئی ایسی چیز مجھ کو محسوس ہورہی ہے جو کھانے سے روک رہی ہے خادم نے کہا اس کھانے میں جو نمک استعمال ہوا ہے وہ بطور قرض لیا گیا ہے آپ نے فرمایا پھر تو میرے لئے اس کا کھانا جائز نہیں۔''

اس طرح کے بے شمار واقعات ان کی زندگی میں ملتے ہیں جن سے صاف صاف شیخ کی دنیا سے بے رغبتی اور جاہ ومنصب اور مال ودولت سے لاتعلقی کا پتہ چلتا ہے،

انہوں نے بہت اہم اہم کارنامے انجام دیئے اور ہندستان کی اسلامی تاریخ میں گہرے نقوش ثبت کئے اور اپنی زندگی کا ایسا خوشگوار نقش چھوڑا جو سدا کے لئے یادگار بن گیا، اور تاریخ نے اس کو آنے والی نسلوں کے لئے اپنے صفحات میں محفوظ کرلیا۔

ایک بار سلطان ناصر الدین محمود نے ان کے پاس ہدیہ بھیجا جس میں کچھ جائداد اور نقد دولت تھی، بادشاہ کے جانشین غیاث الدین بلبن اسے لیکر شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے، جب انہوں نے اس ہدیہ کو شیخ کی طرف بڑھایا، شیخ نے اپنے دائیں بائیں نگاہ ڈالی اور نقد مال لیکر اسے فقراء ومساکین میں اسی وقت تقسیم کردیا اور جائداد کو یہ کہہ کر واپس کردیا کہ یہ ہمارے لائق نہیں ہے۔ سلطان غیاث الدین بلبن شیخ فرید الدین کو بہت محبوب رکھتا تھا اور ان کی غایت درجہ تعظیم کرتا تھا، اس کا خیال تھا کہ شیخ کی دعا عزت وعظمت اور جاہ ومرتبہ کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اس لئے وہ شیخ کے سامنے ایک حقیر وفقیر خادم کی طرح کھڑے ہونے کو اپنے لئے سعادت سمجھتا تھا، یہاں تک کہ وہ شیخ کے خدام خاص اور ان کے متبعین تک کی خدمت کے موقع کو غنیمت تصور کرتا تھا۔

شیخ فرید الدین نے اپنے ایک خادم کے اصرار پر سلطان غیاث الدین کے پاس ایک سفارشی خط تحریر کیا۔ آپ نے اس میں لکھا:

''میں نے ان کے معاملہ کو اللہ تعالیٰ کے حوالہ کردیا ہے، پھر آپ سے ان کے سلسلہ میں رجوع کرتا ہوں، اگر آپ ان پر نظر عنایت کریں تو اصلاً تو عنایت کرنے والا خدا ہے اور آپ شکریہ کے مستحق ہوں گے اور اگر آپ انہیں کچھ عطا نہ کریں تو روکنے والی ذات بھی اللہ تعالیٰ کی ہے، اور آپ اس سلسلہ میں معذور ومجبور ہیں۔''

شیخ فرید الدین گنج شکر کے چند ملفوظات:

فرمایا: کہ خدا تعالیٰ کو اپنے بندوں سے شرم آتی ہے کہ وہ اس کے سامنے ہاتھ پھیلائیں، اور وہ انہیں نامراد واپس کردے۔

فرمایا کہ صوفی کا مطلب ہے کہ ہر چیز اس کی صفائی کا ذریعہ ہو، اور کوئی بھی چیز اس میں کدورت وگندگی پیدا نہ کرے۔

فرمایا کہ صوفی وہ ہے جو موجود چیز سے رضا مند ہو اور غیر موجود کے طلب میں سعی فضول نہ کرے، فرمایا کہ اگر تم بلند مرتبہ پر فائز ہونا چاہتے ہو تو تم کو ولی عہدوں وشاہزادوں سے دور رہنا چاہئے، فرمایا کہ سب سے حقیر ورذیل شخص وہ ہے جس کا مقصد زندگی صرف لباس اور کھانا ہو۔

شیخ فریدالدین کو جو چیز اپنے معاصرین سے ممتاز کرتی ہے ان کا وہ نیستی وفنائیت کا جذبہ تھا اور ان کے دل میں عشق خداوندی کی وہ چنگاری تھی جو ایمان واخلاص اور عشق ومحبت سے فروزاں اور روشن ہوتی تھی، ان کے زمانہ کے دیگر مشائخ میں بھی اس کی نظیر خال خال ملتی ہے، اسی امتیاز نے ان کو خواجہ نظام الدین اولیاء اور شیخ علاء الدین علی احمد صابر کلیری کی تربیت کے ذریعہ ان کو عزت وشرف اور بزرگی وتقویٰ کے اعلیٰ مناصب ومدارج پر فائز کیا، ان لوگوں نے دعوت اسلامی کے میدان میں بے پناہ خدمات انجام دیں اور اس دور میں دعوت اسلامی کو خاص طور سے اس طرح کے مخلصین کی ضرورت تھی جو ہر جہد وجانفشانی اور زور وقوت کے ساتھ اس راہ میں قربانی کے لئے ہمہ وقت تیار رہے اور اس کی تبلیغ واشاعت اور ترویج وتقویت کے لئے اپنی تمام استعداد وصلاحیتوں اور توانائیوں کو صرف کرنے میں شمہ بھر پیچھے نہ ہٹتے ہوں۔ اس عظیم ہستی کی قربانیوں اور فضل وکمال کی وجہ سے اسلامی دعوت کے لئے سرگرم وسرمست افراد مہیا ہوگئے جنہوں نے ہندوستان میں سلسلۂ چشتیہ کی بنیادیں مضبوط کیں اور آج تک دین حنیف کی خدمت کی انجام دہی میں سرگرم علم ہیں۔

۹۵ رسال کی عمر میں ۶۶۴ھ میں ان کی وفات ہوئی۔

مزید تفصیل کے لئے:

- نزھۃ الخواطر — مولانا عبدالحی حسنی
- سیر الاولیاء — شیخ محمد علوی
- فرید اور فرد فرید — محمد اسلم فرخی

خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ

(۵۳۷ھ ۶۲۷ء)

حکمت الٰہی کا تقاضا ہوا کہ ہندوستان شرک و بت پرستی سے پاک ہو، اور یہاں ایمان وعقیدہ اور دین وشریعت اور ایثار وقربانی کی ہوائیں چلنے لگیں۔ اور ان کے تسلسل اور ترویج کی راہ ہموار ہو، مشیت الٰہی یہ بھی چاہتی تھی کہ اس ملک میں اسلام کی صدا بلند ہو، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اس کے اطراف واکناف میں مقبول عام وخاص ہو۔

چھٹی صدی ہجری میں ہندوستان میں ایک ایسا طوفان بلاخیز آیا، جس نے خیر وشر میں کوئی تمیز نہ چھوڑی، اس نے حق وباطل کو ایک نگاہ سے دیکھا، پورے ملک میں معاشرتی اور فکری بے راہ روی عام ہوگئی، اس نے لوگوں کے لئے خیر وفضیلت کا کوئی راستہ نہیں چھوڑا۔ اس کے نتیجے میں انسان کا اللہ تعالیٰ سے ربط وتعلق پیدا کرنے کا داعیہ باقی نہ رہا، اس نے لوگوں کے دلوں میں فاسق عقائد بٹھا دیئے اور ایسے رسم ورواج ان کے اندر سرایت کر گئے کہ جنہوں نے ان کی زندگی کو جاہلی خرافات کا مجموعہ بنا دیا۔

سلطان محمود غزنوی ہندوستان میں فاتحانہ داخل ہوا۔ اور اس کو اسلام کے لئے زیر نگیں کر دیا۔ اور اس نے عقیدہ وتقویٰ کے بنیاد پر ایک ایسی حکومت کی بنیاد رکھی،

جس کا سرکاری مذہب اسلام قرار پایا، جس کی تکمیل چھٹی صدی ہجری میں سلطان شہاب الدین غوری کے ہاتھوں ہوئی، اللہ تعالیٰ نے اس ملک کے لئے یہ مقدر کر دیا تھا کہ شیخ معین الدین چشتیؒ لوگوں کے دلوں میں اسلام کا بیج بوئیں، اور ان پر اسلام کا سکہ بٹھادیں، اس طرح ہندوستان میں ایک روحانی حکومت قائم ہوگئی، جس کا مقابلہ کوئی مادی حکومت نہیں کر سکتی تھی۔ اور اس طرح ملک کی روحانی فتح کی اصلاً تکمیل شیخ معین الدین چشتیؒ کے ہاتھوں لکھی گئی، جو اس ملک میں ایک مثالی اسلامی سوسائٹی کی تشکیل میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

شیخ معین الدین ۵۳۷ھ میں سجستان میں پیدا ہوئے وہاں سے انہوں نے سمرقند کا سفر کیا، وہیں قرآن مجید حفظ کیا اور حسب استطاعت علم حاصل کیا اس کے بعد دوسرے علاقوں میں گئے نیسا پور کے قریب ہارون گاؤں میں داخل ہوئے جہاں ان کی ملاقات خواجہ عثمان ہارونی سے ہوئی، بس وہ انہیں کے ہو کر رہ گئے، وہیں سلوک ومعرفت کی منزلیں طے کیں اور بیس سال ان کی صحبت میں گزارے اس کے بعد ہندوستان آئے اور لاہور شہر میں کافی عرصہ رہے، پھر دہلی ہوتے ہوئے اجمیر آئے، اور وہیں سکونت پذیر ہو گئے، ان کے ہاتھ پر ایک بہت بڑی جماعت نے اسلام قبول کیا، ان کی ایسی کرامتیں اور خوبیاں ہیں جن کو بیان کرنے سے زبان قاصر ہے، جب شیخ معین الدین چشتیؒ ہندوستان تشریف لائے تو فاسد عقائد، مشرکانہ رسم ورواج میں لوگ گھرے ہوئے تھے، شیطان لوگوں کی عقل اور ان کے افکار پر پوری طرح مسلط ہو چکا تھا اور اس نے لوگوں کو مختلف ٹولیوں، گروہوں، اور جماعتوں میں بانٹ رکھا تھا ان میں طبقاتی کشمکش پیدا کر دی تھی، رنگ ونسل کا امتیاز عام ہو چکا تھا، ایک اعلیٰ طبقہ تھا جس کا خیال تھا کہ دوسرے طبقہ کو یہاں جینے اور زندہ رہنے کا حق نہیں ہے، اور ایک انسان کی طرح اس کا معاشرہ میں باقی رہنا درست وجائز نہیں ہے، ان کی عزت ہوتی تھی اور اسی طبقہ کے لوگوں کو بالادستی حاصل تھی، وہ اپنی رعایا پر ایسے ظلم وجور کو روا رکھتے تھے کہ جن کو

سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

لیکن اس خدا ترس بزرگ کی کوششوں سے حالات کا رخ بدلا اور جب سے انہوں نے معاشرے میں اپنا کام شروع کیا تو برائیاں الٹے پاؤں لوٹنے لگیں، تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ خواجہ معین الدین چشتیؒ کے زمانے میں اجمیر و دہلی راجہ پرتھوی راج چوہان کے زیر فرمان تھا، اس بادشاہ کی بہادری اور طاقت وقوت کا بڑا شور و چرچہ تھا، اس کے مقابلہ میں کوئی دوسرا بادشاہ آنکھ اٹھانے کی ہمت نہ کرتا تھا، یہاں تک کہ شیخ سلطان شہاب الدین غوری کا زمانہ آیا تو اس پر پرتھوی راج چوہان نے زبردست حملہ کیا، اور پہلے ہی مرحلہ میں اس کو دشمنوں کی زبردست فوج سے شکست وہزیمت کا سامنا کرنا پڑا لیکن شہاب الدین غوری کی ہمت نہیں ٹوٹی، اس نے شیخ معین الدین سے اپنی کامرانی اور دشمن کی نامرادی کی دعا کی درخواست کی، اور ایک لاکھ فوجیوں کے ساتھ بادشاہ نے دشمن پر دوبارہ حملہ کر دیا، شیخ معین الدین نے صرف دعا ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ وہ بنفس نفیس اس جنگ میں شریک ہوئے اور فاتح کی حیثیت سے جنگ کے میدان سے لوٹے، یہ فتح محض سلطان شہاب الدین یا ہندوستان کی فتح نہیں تھی، بلکہ یہ دلوں کی فتح تھی یہ اس بات کا اعلان تھا کہ خدا کا کلمہ ہی بلند و بالا ہے، اور یہ فتح مستقبل میں اسلامی دعوت اور صالح معاشرہ کے قیام کے لئے خشت اول ثابت ہوئی۔ چنانچہ اسلام ہندوستان میں آفتاب و ماہتاب کی طرح چمکا اور دشمنوں کی مخالفتوں اور شدت پسندوں کے بیچ، دین سے اکھاڑ پھینکنے کی کوششوں کے باوجود اسلام کا علم بلند ہو کر رہا۔

جب شیخ معین الدین اس ملک میں پھیلے ہوئے فتنوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے میں کامیاب ہو گئے۔ تب انہوں نے لوگوں کے حالات کو سدھارنے اور ان کے رسم و رواج اور عقائد کی اصلاح کی جانب توجہ کی، یہاں تک کہ اس سرزمین اور اس کے قرب و جوار پر ان کے ذریعے بے شمار لوگوں نے اسلام قبول کیا اور ہزاروں ہزار کی تعداد انہیں کی محنت اور کاوش سے ہدایت یاب ہوئی۔ اور پورے ہندستانی معاشرہ میں اطمینان وسکون کی فضا چھا

گئی، اور گمراہی و بے راہ روی نے اپنا راستہ لیا، جب کہ صورتحال یہ تھی کہ گمراہی وضلالت لوگوں کے دلوں میں گھر کر چکی تھی، اور اس نے اپنی جڑیں مضبوط کر لی تھیں۔ لیکن اب اس کی جگہ خدا و رسول پر ایمان و یقین نے لے لی تھی اور اسلامی تعلیمات نے اپنے قدم جما لئے تھے۔ جہاں تک ہو سکا انھوں نے لوگوں کی زندگیوں میں اسلام کو عام کرنے اور ان کی اصلاح حال اور انہیں کفر وضلالت کے گھٹاٹوپ اندھیروں سے نکال کر اسلام کی روشنی وتابانی کی طرف لانے کی کوشش کی۔

شیخ محمد مبارک علوی اپنی کتاب ''سیر الاولیاء'' میں شیخ معین الدین چشتی کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

''ہندوستان ایک کونے سے دوسرے کونے تک کفر و بت پرستی میں گھرا ہوا تھا، اور کافر و سرکش لوگ ''انا ربکم الاعلیٰ'' کی صدا بلند کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسروں کو معبود ٹھہراتے تھے اور پتھر، مٹی، درخت و چوپاؤں تک کے آگے اپنا سر خم کرتے تھے کفر و شرک کی تاریکیوں نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی تھی، وہ دین و شریعت سے بالکل بے پروا، اور خدا و رسول سے ناواقف تھے۔ نہ انہوں نے قبلہ کو جانا اور نہ کبھی اللہ اکبر کی صدا ان کے کانوں میں پڑی۔ وہ جاہلیت اور گمراہی کے اندر ڈوبے ہوئے تھے۔ اسی دوران شیخ معین الدین چشتیؒ آئے۔ اور ان کی مساعی سے جاہلیت کا بادل چھٹ گیا، تاریکیاں دور ہوئیں اور اسلام نے اپنے نور سے اس سرزمین کو روشن و منور کر دیا۔ زمین نے اپنا چولا بدل دیا اور شرک اور شرک کے مظاہر راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ یہاں مسجدوں کی تعمیر ہونے لگی، اور ان کے منبروں سے صدائے ''اللہ اکبر'' گونجنے لگی اور اس ملک کو اسلام کی نعمت عطا ہوئی اور قیامت تک جو بھی اس سے بہرہ ور ہوگا وہ شیخ معین الدین کے حسنات میں اضافہ کا سبب بنتا رہے گا اور قیامت تک اس کا اجر شیخ معین الدین تک پہونچتا رہے گا۔''

''سیر الاقطاب'' کے مؤلف تحریر فرماتے ہیں کہ

''ان کی جہد و جانفشانی سے ہندوستان میں اسلام برگ و بار لایا۔ اور کفر کی تاریکیاں چھٹیں۔''

۷۵۵۳
۱۴۷۴۱۱

ابوالفضل فیضی اپنی کتاب ''آئین اکبری'' میں رقم کرتے ہیں کہ

''انہوں نے اجمیر میں قیام کے دوران شمع اسلام کو روشن کیا، اور قلب کو نور ایمانی سے مزین کیا، اور ان کی مساعی اور کدو کاوش سے لوگ فوج در فوج مشرف بہ اسلام ہوئے۔''

ہندوستان میں رہنے والا ہر فرد مسلم شیخ معین الدین چشتیؒ کا زیر بار و ممنون کرم ہے، کیونکہ یہاں پائی جانے والی اسلامی زندگی کے تمام نقوش و اثرات انہیں کے رہین منت ہیں، اور ان سب کا فضل انہیں سے وابستہ ہے، تاریخ اتنا عرصہ گذر جانے کے بعد بھی ان کے اس ملک پر احسانات و اکرامات کو فراموش نہیں کر سکی۔ اس شخصیت کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے تاریخ کے صفحات پر اپنا نام ہمیشہ ہمیش کے لئے نقش کر دیا۔ ان کی یادیں اور کارنامے روز بروز چمکتے دمکتے اور روشن و منور رہیں گے۔

شیخ معین الدین چشتی نے اپنے جہد و عمل اور دعوت و فکر کو جاری رکھنے کے لئے شیخ قطب الدین بختیار کاکیؒ کو اپنا جانشین بنایا۔ جنہوں نے دہلی میں رہ کر دعوت اسلام کو عام کیا، ان سے بھی ایک کثیر تعداد فیضیاب ہوئی۔ اور سلسلہ چشتیہ نے عزت و سربلندی کی بلند چوٹیوں کو سر کیا اور ایک عالم نے ان کے فیوض سے فائدہ اٹھایا، اور یہ سلسلہ ان شاء اللہ جاری رہے گا۔

شیخ معین الدین چشتیؒ کی وفات ۶۲۷ھ کو ہوئی، انہوں نے عظیم کارناموں کو انجام دے کر اپنی کتاب زندگی کے اوراق مکمل کئے، اور نصف صدی تک وہ لوگوں کی رہنمائی کرنے اور ان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی جانب لانے میں سرگرم عمل رہے ان کی دعوت و جہاد کی جڑیں اس ملک میں بہت گہری ہیں جس کے نتائج سے ان کے بعد میں آنے والے مسلمانوں نے فائدہ اٹھایا اور ان کے خلفاء نے آنے والی نسلوں کے لئے رہ نما خطوط متعین کئے۔

تفصیل کے لئے ملاحظہ کریں۔

- سیرالاولیاء
- سیرالاقطاب
- تاریخ دعوت وعزیمت
- تاریخ مشائخ چشت

اس مضمون میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی کتاب تاریخ دعوت وعزیمت سے خصوصی طور پر استفادہ کیا گیا ہے۔

شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ

(۵۶۶ھ ۶۶۶ء)

سرزمین ہند کی اسلامی تاریخ ایسے عارف باللہ اور مردان حق سے آباد ہے جنہوں نے علم ظاہر و باطن پر یکساں طور پر مہارت حاصل کی، اور خالق و مخلوق کے مابین معرفت صحیحہ حاصل کی، یہاں کی تاریخ اگر روحانی واقعات اور تعلق مع اللہ کے قصوں سے لبریز ہے، جو دلوں کو غذا فراہم کرتے ہیں، تو ایسی بے شمار مثالیں بھی موجود ہیں جو اپنے پہلو میں انسانیت کے لئے درس عبرت لئے ہوئے ہیں خاص طور سے ان کے لئے جو اپنے پہلو میں ایک دھڑکتا ہوا دل رکھتے ہوں اور جو احساس و شعور کی نعمت سے بہرہ ور ہوں اور یہ ایسے نمونے ہیں جن کا افادہ ختم ہونے والا نہیں اور جن کا چشمۂ فیض خشک ہونے والا نہیں۔

شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی صرف ایک ولی کامل عارف باللہ نہ تھے اور نہ محض ان لوگوں میں تھے جو علم و ایمان اور معرفت و عشق کے جامع کمالات ہوتے ہیں بلکہ ان تمام کے ساتھ ساتھ وہ اپنے زمانہ کے رئیسوں اور مرفہ الحال لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ اللہ تعالیٰ

نے ان کو ایمانی علم کی دولت کے ساتھ ساتھ دنیاوی ثروت و وجاہت بھی عطا کی تھی، اور اس قدر مال و دولت سے نوازا تھا کہ وہ بے دریغ اس کو خدا کی راہ میں صرف کیا کرتے تھے، ان کی مثالی شخصیت ان مومن وصادق لوگوں کے مصداق تھی جن کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

الذین ینفقون اموالھم فی سبیل اللہ ثم لا یتبعون ما انفقوا منا ولا اذیٰ، لھم اجرھم عند ربھم۔ ولا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔ (البقرۃ : ۲۶۲)

ترجمہ: جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی راہ میں، پھر خرچ کرنے کے بعد نہ احسان رکھتے ہیں اور نہ ستاتے ہیں انہیں کے لئے ہے ثواب ان اپنے رب کے یہاں اور نہ ڈر ہے ان پر اور نہ غمگین ہوں گے۔

شیخ بہاء الدین زکریا ملتان کے ایک گاؤں قلعہ کوٹ میں ۵۶۶ھ یا ۵۷۸ھ میں پیدا ہوئے، ان کی والدہ شیخ حسام الدین ترمذی کی صاحبزادی تھیں جو خود اپنے زمانہ کے بڑے علماء مشائخ میں شمار کئے جاتے تھے، جب شیخ بہاء الدین بارہ سال کے ہوئے تو ان کے والد اس دار فانی سے کوچ کر گئے، اس کے بعد شیخ بہاء الدین نے بخارا کا سفر کیا اور وہاں کے بڑے اساتذہ وشیوخ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، اس کے بعد حجاز مقدس تشریف لے گئے، حج بیت اللہ اور مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے سرفراز ہوئے اور مدینہ منورہ میں پانچ سال تک شیخ کمال الدین محمد الیمانی سے حدیث شریف کا درس لیا اور اس میں کمال حاصل کیا، چنانچہ فن حدیث میں مہارت ودسترس کی وجہ سے ان کی خوب شہرت ہوئی اور محدث کے لقب سے جانے جانے لگے، اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک باخبر عالم، مشہور محدث اور امام بنایا جس سے لوگوں کو فیض پہونچا اور علم ومعرفت کی جانب انہوں نے لوگوں کی راہ نمائی کی۔

حجاز مقدس میں حج وزیارت سے فراغت اور حصول علم کے بعد انہوں نے بیت المقدس کا قصد کیا اور مسجد اقصیٰ اور امام انبیاء کی زیارت کی، بیت المقدس سے بیعت

وارادت کی تڑپ لیکر وہ بغداد کی جانب چل پڑے اور علم باطن کے حصول اور روحانی علوم کے انوار سے منور ہونے کی غرض سے کسی مرشد کی تلاش وجستجو میں سرگرداں ہوگئے، اللہ تعالیٰ نے ان کی اس آرزو کو پورا کیا اور انہوں نے عوارف المعارف کے مصنف شیخ شہاب الدین عمر بن سہروردی سے بیعت کی اور ان کے علوم کے سرچشموں سے خوب سیراب ہوئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں ارشاد وسلوک کے ہمالہ جیسے بلند وبالا مناصب پر فائز ہوگئے اور اس لائق ہوگئے کہ وہ غافل اور گم کردہ راہ افراد کی ہدایت اور ان کی رشد وفلاح کا سامان بہم پہونچائیں۔ بغداد سے ملتان کا رخ کیا اور بالآخر اس کا روان علوم ومعرفت نے اس سرزمین پر آکر پڑاؤ ڈالا جہاں سے علم کی پیاس لیکر اس نے دنیا کے کوچہ کوچہ کا چکر لگایا تھا اب اس کی علم ظاہری اور باطنی کی پیاس بجھ چکی تھی اور وہ سیر ہوکر منزل مراد سے جا لگے تھے، ان کے اندر اس قدر علوم وفضائل جمع ہوگئے تھے کہ اس دور میں ان کا کوئی ہم پلہ نظر نہ آتا تھا، شیخ بہاء الدین اپنے وطن میں ایک کامیاب وشادماں مسافر کی طرح واپس ہوئے، ان کا دل خدا تعالیٰ کی جانب سے عنایت کردہ علم ومعرفت کی دولت پر نازاں وفرحاں تھا، خدا تعالیٰ نے ان کو دین کے فہم اور اس کے تقاضوں سے آشنائی بخشی اور انہوں نے لوگوں کو راہ راست کی جانب لے جانے اور ان کی ہدایت کے لئے جہد وعمل کا آغاز کیا وہ لسان حال سے یہ صدا لگا رہے تھے۔

قل هذه سبيلي أدعوا الى الله على بصيرة انا ومن اتبعني وسبحان الله وما أنا من المشركين (سورة يوسف: ۱۰۸)

ترجمہ: کہہ دے یہ میری راہ ہے، بلاتا ہوں اللہ کی طرف سمجھ بوجھ کر، میں اور جو میرے ساتھ ہے، اور اللہ پاک ہے، اور میں نہیں شریک بتانے والوں میں۔

مؤرخین لکھتے ہیں:

''شیخ بہاء الدین نے جب ہدایت وارشاد کے علم کا آغاز کیا تو ان کے ارد گرد مخلوق خدا ٹوٹ پڑی اور ہر چہار جانب سے لوگ ان پر پروانہ وار فدا ہونے لگے،

جیسا کہ ایک تشنہ کام اپنے جام پر ٹوٹ پڑتا ہے اور یہی مقبولیت ومحبوبیت ان کا امتیاز ثابت ہوئی، جو اس دور کے علماء ومشائخ میں سے اللہ تعالیٰ نے کسی کو بھی عطا نہیں کی تھی۔''

اللہ تعالیٰ نے ان کو علوم ومعرفت کے ساتھ ساتھ، مال واسباب اور جائداد کے بھی بیش بہا خزانے عطا فرمائے تھے وہ اسے مستحق طالب علموں اور فقراء ومساکین پر صرف کیا کرتے تھے، اس طرح ان کے اندر بیک وقت تعلیم تعلم اور ضرورت مندوں وبیکسوں پر مال واسباب صرف کرنے کے دونوں فضائل جمع ہوگئے تھے۔ اور یقیناً یہ ایک تاریخ ساز خصوصیت ہے جس کی مثال تاریخ میں کم ملتی ہے۔

شیخ زکریا بن محمد سلوک ومعرفت کے اعلیٰ مناصب پر فائز تھے اور انہوں نے بیعت وارشاد کی بے مثال خدمات انجام دیں۔ اسی کے ساتھ وہ ایک بڑے محدث بھی تھے، اپنے مریدین اور پیروکاروں کو وہ علم حدیث کا درس ایک مخصوص نظام وترتیب کے ساتھ دیا کرتے تھے اور اس بنا پر ان کے مدرسہ سے ایسے فیض یافتہ افراد نکلتے تھے جو سلوک ومعرفت اور دیگر علوم وفنون کے جامع ہوتے تھے، اور علم وعمل کا حسین امتزاج ہوا کرتے تھے اور زندگی کو اپنے علم کے مطابق ڈھالنے والوں کے لئے وہ ایک بیش قیمت نمونہ ہوا کرتے تھے۔

شیخ محمد نورالدین اپنی تصنیف 'سلسلۃ الذہب'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''وہ سرزمین ہند میں اولیاء کے سردار تھے، ظاہری علوم کے عالم اور مشاہدات ومکاشفات کے مختلف احوال ومقامات کے مالک تھے، وہ ایک مرشد ومربی تھے اور اولیاء کے متعدد سلسلے ان سے وابستہ تھے، کفر وبے ایمانی اور معصیت ونفسانیت سے ایمان وطاعت اور روحانیت کی جانب ہدایت میں ان کی الگ ہی شان تھی اور ان کو اس میدان میں عظمت وانفرادیت حاصل تھی۔

ان کے چند مواعظ یہ ہیں۔

''بندہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ صدق دل سے اور اخلاص کے ساتھ اپنے رب کی عبادت کرے، اور اپنے ذہن سے غیروں کو نکال کر، عبادت واذکار میں

اپنی شخصیت کو مٹائے بغیر یہ چیز حاصل نہیں ہوتی ہے، حالت کو بہتر کرنے اور سدھارے بغیر چارہ نہیں ہے، اور اسی طرح بندہ کو اپنے قول وعمل میں احتساب نفس سے کام لینا چاہئے۔ اور بقدر ضرورت قول وعمل کرنا چاہئے، اور ہر کردار وگفتار کے لئے خدا ہی سے التجا کرنی چاہئے۔ اور اس سے ہر عمل کے لئے خیر کو طلب کرنا چاہئے۔''

اپنے بعض اصحاب کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''ذکر میں دوام لازم ہے، اس لئے کہ طالب اپنے محبوب تک ذکر ہی کے وسیلہ سے پہنچتا ہے۔ اور محبت ایسی آگ ہے جو ہر خراب مادہ کو خاکستر کر دیتی ہے، جب محبت غالب ہو جاتی ہے تو ذاکر کا ذکر مذکور کے لئے مشاہدہ کے ساتھ ہوتا ہے یہی وہ ذکر کثیر ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول میں نصرت کا وعدہ فرمایا ہے۔ اذکروا الله كثيرا لعلكم تفلحون۔

فرمایا: جسم کی سلامتی قلت طعام میں ہے اور روح کی سلامتی ترک انام (مخلوق) میں ہے۔ اور دین کی سلامتی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے میں ہے۔''

(نزہۃ الخواطر جلد اول ص ۱۵۸)

ان کی پوری زندگی ایک صاف شفاف آئینہ اور کھلی کتاب کی طرح تھی، جس میں تمام بلند انسانی خصوصیات صاف جھلکتی ہیں، جو عقل وجذبات کو بے پناہ روحانی غذا فراہم کرتی ہیں ان کے ذریعہ انسان اپنی زندگی کو سنوارنے اور نفس کے تزکیہ وتطہیر پر قادر ہوتا ہے، اور اس کو اس پر قدرت ہو جاتی ہے کہ اس آئینہ میں اپنی زندگی کو دیکھ کر اس کو تمام گرد وغبار اور آلائش سے صاف کرے اور اس میں ہر زینت بخش چیز کو استعمال کرے، اس لئے کہ قوی ایمان زندگی کو پاکیزہ بناتا ہے اور اس کو ہر مومن کے لئے ایک شفاف آئینہ بنا دیتا ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے "المؤمن مرآة المؤمن" مومن کی زندگی مومن کے لئے آئینہ ہے۔

ہم زندگی کے اس آئینہ کے سامنے کھڑے ہوئے اپنی زندگی کے نقائص اور اس کی آلائشوں کو دھو کر اسے صاف شفاف بنا سکتے ہیں اور ہر بگاڑ اور کج روی سے اس کو

بچا کر آراستہ و پیراستہ کر سکتے ہیں۔

پورے سو سال تک لوگوں کی اصلاح کرتے ہوئے، ان کو ٹوکتے، تنبیہ کرتے اور رشد و ہدایت کا سامان فراہم کرتے ہوئے زندگی گذارنے کے بعد یہ پروانہ خدا کے حق پر قربان ہو گیا اور ۶۶۶ھ میں اس نے اپنی زندگی کی آخری سانس لی، اور ملتان کے قبرستان میں وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پیوند خاک ہو گئے۔ رحمہ اللہ ورضی اللہ عنہ۔

مزید تفصیل کے لئے:

- نزھۃ الخواطر — مولانا عبدالحی حسنی
- سیر الاولیاء — شیخ محمد علوی
- سیر الاقطاب — محمد اسلم فرخی
- تاریخ ملتان
- تاریخ مشائخ چشت

شیخ قطب الدین بختیار کاکیؒ

۵۸۲ھ-۶۳۳ھ

سلطان شمس الدین التمش کے دور حکومت میں سرزمین دہلی شیخ قطب الدین کاکی کی تشریف آوری سے فیضیاب ہوئی یہ شخصیت ایک ایسے مینارہ نور کے مصداق تھی جس سے سالکین گھٹا ٹوپ رات کی تاریکی میں روشنی حاصل کرتے اور راہ یاب ہوتے تھے۔اور وہ محض عام انسانوں کے لئے ہی روشنی کا مینار نہ تھے بلکہ ان کی یہ فیض رسانی امراء وسلاطین بادشاہوں اور فرمانرواؤں تک عام تھی۔اور بغیر کسی فرق وامتیاز کے ہر خاص وعام اس مشکوۃ نبوت سے فیضیاب ہوتا تھا،اس لئے کہ عرصہ تک تاریکی میں رہنے کے بعد ہر کس وناکس روشنی وتابانی کا بے صبری سے منتظر تھا اور مسلسل تاریکی کی وجہ سے ہر فرد بشر روشنی کی پو پھٹنے کا شدت سے مشتاق وآرزومند تھا۔

جس قوت سے شیخ معین الدین چشتیؒ اجمیر میں فلاح وہدایت کی صدائے پرزور بلند کررہے تھے اور تاریک دلوں کو ایمان ومعرفت اور محبت وعشق کے نور سے منور کررہے تھے۔اس وقت شیخ قطب الدین کاکی دہلی کی سرزمین میں ایمان ومعرفت کے بیج بورہے تھے اور لوگوں کے دلوں میں ایمان ومعرفت کا نور بھر رہے تھے،اور بھٹکے ہوئے لوگوں کو امن وسلامتی کے راستہ سے ہمکنار کررہے تھے۔انہوں نے کتنے دلوں کو نور ایمان سے روشن ومنور کردیا،اور کتنی عقلوں کو اللہ عزوجل کی معرفت سے صیقل وشفاف کردیا،اور کتنے ہی

غافل ذہنوں کو ایمان ویقین کے لئے کھول دیا۔

شیخ قطب الدین کا شمار بہت بڑے خاصان خدا اور اولیاء اللہ میں ہوتا ہے ان کو شیخ معین الدین چشتیؒ نے محض بیس سال کی چھوٹی سی عمر میں ہی خلعت اجازت سے سرفراز کیا تھا، اس لئے وہ جسم وجان سے خدا تعالیٰ کے لئے یکسو ہو گئے اور انہوں نے اپنی پوری زندگی لوگوں کو دعوت الی اللہ کے لئے وقف کر دی۔ ایمان ویقین اور تقویٰ جیسی عظیم بنیادوں پر لوگوں کی تربیت کی اس کے نتیجہ میں ایک ایسی مسلمان نسل وجود میں آئی جو داعی اسلام تھی جس نے خود کو عبادت وریاضت کے لئے کھپا دیا اور اسلام کے پیغام کو عام کرنے کے لئے اور معاشرہ میں شریعت اسلامیہ کے نفاذ کے لئے تن من کی بازی لگا دی۔

شیخ قطب الدین کا کی ماوراء النہر کے حدود میں فرغانہ کے اطراف میں واقع شہر اوش میں پیدا ہوئے، ڈھیڑ سال کی عمر میں ہی ان کے والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اس لئے وہ اپنے والد کمال الدین کا کی کی سرپرستی اور دست شفقت سے محروم ہو گئے۔ پانچ سال کی عمر میں مدرسہ میں داخل ہوئے، اور شیخ ابو حفص معلم اوشی سے پڑھنا شروع کیا، اس کے بعد بغداد گئے وہاں ان کی فقیہ ابو اللیث سمرقندی کی مسجد میں شیخ معین الدین چشتیؒ سے ملاقات ہو گئی، ایک عرصہ تک انہیں کی صحبت میں رہے۔ چنانچہ شیخ نے ان کو خلافت واجازت سے سرفراز فرمایا اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے یہ مقدر کیا تھا کہ وہ اپنے ملک سے ہندستان ہجرت کریں اور اسی کو اپنا مولد ومسکن بنائیں چنانچہ انہوں نے اپنے اہل وعیال اور مال واسباب کو چھوڑ کر ہندستان کا رخ کیا، ان کی یہ ہجرت فتنہ تاتار کے برپا ہونے کے وقت ہوئی۔ یہ فتنہ عالم اسلام کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلا ہوا تھا جس کو سن کر روح کانپ جاتی ہے، جس میں ایک انسانی ریوڑ (بھیڑ) ساری اسلامی آبادی کو نیست ونابود کئے دے رہی تھی اور یہ واقعہ تاریخ انسانی میں ہمیشہ برے الفاظ کے ساتھ یادگار رہے گا۔ شاید یہی فتنہ تاتار ان کی اپنے وطن سے ہجرت کا باعث بنا، ہندوستان میں اس وقت ایک زیرک، مدبر، اور خوش خصال نوجوان مسلمان بادشاہ حکمراں تھا، اس نے علماء

وحکماء کی خدمت اور ہندوستان میں دین حنیف کی اشاعت میں نمایاں کردار ادا کیا، یعنی سلطان شمس الدین التمش، لیکن ان کی اس ہجرت کا اصل محرک ہندوستان میں شیخ معین الدین چشتی کی موجوگی تھی، جب وہ دہلی پہونچے تو ان کے علم ومعرفت اور زہد وتقویٰ کی علامتوں کی وجہ سے اہالیان دہلی نے ان کی قدر کی، اور وہ ان پر ٹوٹ پڑے، اور ان کی دہلی میں بڑی پذیرائی ہوئی۔

ان کے مریدین ومحبین کی ایک بڑی جماعت ان کے پاس اکٹھا ہوئی، اور مسلمانوں کے اندر ان کی مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہونے لگا، یہاں تک کہ اس زمانہ کے ایک ولی کامل اور بزرگ شیخ الاسلام نجم الدین جو دہلی میں تھے انہوں نے اس کو محسوس کرلیا، اور جب شیخ معین الدین چشتیؒ اپنے شاگرد ومرید شیخ قطب الدین سے ملاقات کے لئے دہلی تشریف لائے تو شیخ الاسلام نے ان سے شیخ قطب الدین کی شکایت کردی، شیخ معین الدین چشتی نے ان سے دہلی سے اجمیر چلے جانے کا مطالبہ کیا۔ جہاں وہ خود لوگوں کی ہدایت ورہنمائی کے لئے سرگرم تھے، اور فرمایا کہ میں تمہارے لئے ایک خادم وفرمانبردار کی حیثیت سے رہوں گا اور ہر آن اور لمحہ آپ کی خدمت کے لئے تیار رہا کروں گا۔

یہ الفاظ اس دور کے علماء ومشائخ کے قافلہ سالار اور عارفین وسالکین کے امام خواجہ اجمیری نے اپنے شاگرد ومرید شیخ قطب الدین کے سامنے کہے نہ انہوں نے اپنے خادمانہ جذبات کے اظہار اور ایک شاگرد رشید کی طرح ان کی خدمت کرنے میں کوئی عار محسوس نہ کی۔ اور نہ ہی ان کے سامنے اس انکساری سے انہیں ندامت ہوئی، اس لئے کہ وہ احسان ومعرفت کے بلند مرتبہ پر فائز تھے، اور اس میں ندامت وشرمندگی کی بات ہی کیا تھی، ان کے نزدیک ان کا ایک مرید درجات میں کافی آگے بڑھ چکا تھا۔ اور علم ومعرفت اور ولایت وسلوک کے میدان میں اس نے اپنی فتح مندی کا علم بلند کردیا تھا، اور ایک منکسر ومتواضع شخص ہونے کی وجہ سے وہ اپنے عجز وضعف کا اظہار کیوں نہ کرتے وہ تو نفس کی پیروی سے بے پرواہ ہر معاملہ میں اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور اس کی قبولیت کی میزان میں ہر

چیز کو تولتے تھے، انہوں نے شیخ قطب الدین کی شخصیت میں وہ شاگرد دیکھ لیا تھا۔ جس کو انہوں نے سلوک و معرفت کے مبادی سکھائے تھے، اور مسجد فقیہ ابواللیث سمرقندی میں اپنی بصیرت اور معرفت کی بنیاد پر ان کو اجازت عطا کی تھی، اور انہوں نے اس کو اپنے منصب سے بڑھ کر منصب والا پایا تھا، اور اس کو دین کی خدمت اور اشاعت اسلام کے لئے ہر طرح سے یکسو اور فارغ پایا تھا، اس لئے وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی وجہ سے شیخ الاسلام نجم الدین کو تکلیف ہو، وہ عارفین و سالکین کی جماعت میں ادنیٰ اختلاف بھی پسند نہ کرتے تھے، اس لئے کہ اس کا اثر براہ راست معاشرے و حالات پر پڑتا ہے، شیخ معین الدین نے اس سلسلہ میں فراست سے کام لیا، اور شیخ قطب الدین کو شیخ الاسلام کی شکایت سے باخبر نہ ہونے دیا کہ وہ اس سے انہیں تکلیف ہوتی، اور وہ رنجیدہ خاطر ہوتے۔

لیکن ذرا شیخ قطب الدین کی ہوشمندی اور سعادت مندی دیکھئے، انہوں نے دہلی سے اجمیر طلبی اور ان کی خدمت کے لئے اپنے استاد کی آمادگی کے بارے میں عرض کیا۔

پیر و مرشد! میری حیثیت تو یہ ہے کہ میں پاس بیٹھنا تو درکنار آپ کے سامنے کھڑے ہونے کے لائق بھی نہیں۔ اس پر شیخ معین الدین نے ان کو اجمیر چلنے کا حکم دیا، انہوں نے اس حکم کی پیروی کی، اور اپنے شیخ کے ساتھ چل پڑے، لیکن صورتحال یہ تھی کہ ان کے نکلتے ہی دہلی پر قیامت ٹوٹ پڑی، لوگوں کی آہ و بکا کی صدائیں آسمان ڈھائے دے رہی تھیں، اور سرزمین دہلی شیخ قطب الدین کے ہجر سے ماتم کناں تھی، خلق خدا ان کے پیچھے پیچھے چل پڑی، اور انہیں میں ان کا بادشاہ شمس الدین التمش بھی اس درویش کی دہلی واپسی کے لئے آرزومند تھا، دہلی ان کے غم میں آنسو بہا رہی تھی، اور پورا شہر غمزدہ اور فراق یار میں نم دیدہ تھا، شیخ معین الدین چشتیؒ نے جب دہلی کے لوگوں کے دلوں میں ان کی اس قدر مقبولیت کا مشاہدہ کیا، کہ وہ ان کے فراق کے صدمہ کو برداشت نہ کرسکیں گے، تو سمجھ گئے کہ یہ خدا کی طرف سے ایک اشارہ ہے انہوں نے شیخ قطب الدین کو یہ فرماتے ہوئے دہلی واپس کردیا۔

اے شیخ بختیار! تم جہاں سے آئے ہو وہیں چلے جاؤ اور وہاں رہو، اس لئے کہ تمہارے فراق سے مخلوق کا برا حال ہوا جاتا ہے، اس لئے اتنے دلوں کو اذیت دینا اور ان کو رنجیدہ کرنا میرے لئے جائز نہیں ہے۔ تم واپس چلے جاؤ میں نے دہلی شہر تمہاری ولایت اور خدمت میں دے دیا۔

لوگوں نے خاص طور سے بادشاہ نے شیخ معین الدین کے اس احسان کا شکریہ ادا کیا، شیخ خود اجمیر چلے گئے، اور شیخ قطب الدین دہلی واپس آئے، اور وہاں پھر لوگوں کو فیض پہونچانے اور ارشاد و ہدایت اور کلمہ اسلام کو بلند کرنے میں مصروف ہو گئے، اور وہاں کے بادشاہ سے بے نیاز ہو کر خدا کی عطا کردہ محبوبیت و مقبولیت کے ساتھ انہوں نے دین اسلام کی خدمت کی، اور ہر فرد و بشر نے خواہ وہ امیر ہو یا غریب، سب نے ان سے فائدہ اٹھایا اور ان سے دین کی تعلیم حاصل کی۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی ''اخبار الاخیار'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''انہوں نے پوری زندگی اہتمام دعوت میں بسر کی، اور علماء و امراء اور ائمہ کرام ان کے لئے دست بدعا ہوتے تھے، سلطان شمس الدین التمش جو اپنے زمانہ کے عظیم شہنشاہوں میں شمار ہوتا تھا، اور اس نے پورے ہندوستان کو زیر نگیں کر لیا تھا، اس کا بھی یہ حال تھا کہ وہ شیخ قطب الدین سے اجازت طلب کرتا ان کی درویشانہ خانقاہ میں داخل ہوتا، اور ایک متواضع اور فرمانبردار شخص کی طرح ان کو سلام کرتا، ان کے قریب جاتا، خدمت کرتا اور خوب روتا تھا، یہاں تک کہ شیخ اس کے لئے دعا کرتے، اور اس کو واپس ہونے کا حکم دیتے تھے، اس دور میں جیسا کہ دہلی میں اساتذہ و شیوخ اور علماء کرام کا جم غفیر تھا، دعوت اسلامی کے میدان میں دعوت و تجدید کا عمل ایک مشکل اور دشوار کام تھا، اور تعلیم و تربیت کا عمل تو اس سے بھی مشکل تھا، اور بغیر کسی جاہ اور اعلیٰ سے اعلیٰ منصب کی خواہش اور مال و دولت کی طمع کے نومولود اسلامی سلطنت کی رہنمائی ایک بڑا کام تھا، اور اس میں اس کا لحاظ بھی ضروری تھا کہ علماء مشائخ کی صفوں میں کوئی اختلاف و ناگواری نہ واقع ہو، ان میں اتحاد و یکسانیت برقرار رہے، اور اس طرح کے کام کے لئے سب کے

ساتھ ان سب کو متحد رکھنے کا ارادہ تھا۔ لیکن خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اس کے لئے جو طریق کار اختیار کیا اس نے سب کو متحد رکھا، اور سب کے دلوں میں خدمت اسلام کا جذبہ موجزن کر دیا۔ ان کے مرید وخلیفہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی نے بھی اس طریق کار کو اختیار کر کے ہندستان میں مخلص داعیوں کی ایک پوری جماعت تیار کر دی۔ اور خواجہ معین الدین چشتیؒ کے لگائے ہوئے سلسلہ چشتیہ کے پودے کو تناور درخت بنا دیا۔ اور اس کے ذریعہ خاص دینی، دعوتی خدمات انجام پائیں۔ اور انھوں نے بڑی حد تک دعوت وارشاد کی ذمہ داریاں پوری کر دیں۔''

اگر شیخ قطب الدین کو مہلت ملتی، اور وہ اپنے پیر ومرشد کے بعد زیادہ دن زندہ رہتے تو یقیناً ان کے دینی اور دعوتی کارنامے، اور ان کے ذریعہ تیار کئے گئے، مرشدین اور داعیوں کی مقدار دوگنی ہوتی۔ لیکن پچاس یا اس سے کچھ زائد سال کی مختصر مدت میں ان کا انتقال ہو گیا۔

انہوں نے اپنے عملی اور دعوتی کاموں کا جانشین بابا فرید الدین مسعود اجودھنی کو مقرر کیا جنہیں بجا طور پر ہندستان میں سلسلہ چشتیہ کا مجدد اور تکمیل کرنے والا کہا جاتا ہے۔

مزید تفصیل کے لئے:

- نزھۃ الخواطر — مولانا عبدالحی حسنی
- سیر الاولیاء — شیخ محمد علوی
- تاریخ مشائخ چشت
- اخبار الاخیار

شیخ احمد سرہندیؒ

حضرت مجدد الف ثانی

(۱۵۶۴ء--۱۶۲۴ء)

اللہ تعالی نے حضرت مجدد الف ثانی جیسی عظیم شخصیت کو سرزمین ہند میں اسلام کی آبیاری کے لئے منتخب فرمایا تا کہ وہ اس ملک کی اسلامی تاریخ میں جہاد و مجاہدہ اور دعوت و عزیمت کی ایک طویل داستان چھوڑ جائیں، حضرت مجدد صاحب ایک ایسے ولی با صفا تھے، جو ولایت کی بلند منزلوں پر فائز تھے اور ایسے عارف باللہ تھے جس سے زیادہ بلندی کا تصور محال ہے۔ یہی شان امتیازی ہے جس نے ان کو تاریخ اسلامی ہند میں قابل فخر بنا دیا اور اس کی بنا پر ہندوستان کے بچے بوڑھے اور مرد و عورت ان کی شخصیت کے لئے ثنا خواں اور رطب اللسان نظر آتے ہیں۔

ہم بار بار حضرت مجدد الف ثانیؒ کے بارے میں سنتے اور پڑھتے ہیں، وہ اپنے زمانہ کے شہنشاہ اور سب سے بڑی طاقت کے سامنے سینہ سپر ہو گئے تھے، انہیں اولیاء و ربانین کا سردار اور علماء و عارفین کا سرخیل سمجھا جاتا ہے، وہ ایک قوی الایمان اور صاف دل بزرگ تھے، اور خدا اور رسول کے سچے و پکے عاشق تھے، انہوں نے جو کارنامے انجام دیئے وہ نہایت حیرت انگیز محیر العقول ہیں۔

گیارھویں صدی ہجری کے اوائل میں نہ صرف ہندوستان بلکہ پورا عالم

اسلام زبوں حالی کا شکار تھا، مسلمانوں کے عقیدہ وایمان میں ضعف داخل ہو چکا تھا، انہیں خواب غفلت سے بیدار کرنے والا کوئی نہ تھا، نہ ہی کوئی ان کی کھوئی عظمت کی بازیابی کے لئے فکر کرنے والا تھا، باطل طاقتوں نے مسلمانوں کی اس غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسلام کی عظمت تار تار کرنے اور اس کے قلعہ کو مسمار کرنے کے منصوبے رچنے شروع کر دیئے، اور وہ اسلام کی عمارت کو منہدم کر کے کفر والحاد کا بازار گرم کرنے لگے، ان باطل طاقتوں کو حکومت اور ارباب اقتدار کی پشت پناہی حاصل ہوگئی تھی جس کی وجہ سے ان کی سرگرمیاں دو چند ہوگئیں۔ اور دین کی ذلت وپستی ضیاع اور مسلمانوں کے الحاد کا خطرہ ان کے سر پر منڈلانے لگا، مسلمانوں پر کفر والحاد کے ان منڈلاتے ہوئے بادلوں نے شیخ احمد سرہندی کی نیند حرام کر دی، اور وہ بے چین ومضطرب ہوگئے، اور وہ اس عظیم خطرہ سے حفاظت کا سامان کرنے لگے تا کہ اس کی بیخ کنی کے ذریعہ اسلام کے کلمہ کو سربلند کیا جائے۔ اور ہندستان کی اسلامی آبادیوں کو ایمان ومعرفت کی دولت سے از سر نو بہرہ ور کیا جائے، اور عزت ووقار اور سکون واطمینان کی فضا پھر قائم ودائم ہو، انہوں نے اس معرکہ کو ایمان ویقین کی قوت سے سر کرنے کا عزم کر لیا، اور میدان میں کود پڑے، یہ معرکہ کوئی معمولی معرکہ نہ تھا، یہ کفر واسلام کی جنگ تھی، اور یہ معرکہ عقیدہ والحاد کا معرکہ تھا، انہوں نے ایمان وعزیمت کی طاقت سے اس کا پرزور مقابلہ کیا، یہاں تک کہ ان کے مدمقابل تمام طاقتیں لرزہ براندام ہوگئیں، اور ان کے خلاف اٹھنے والی ہر صدا دب کر رہ گئی، انہوں نے تمام فتنوں کو اپنے پیروں تلے روند ڈالا، اور جب بادشاہوں اور امراء کو اپنے عہدۂ ومناصب اور حکومت وسلطنت کا خطرہ لاحق ہونے لگا تو وہ آپ کے درپے آزار ہوگئے، اور طرح طرح کی تکلیفیں پہونچانی شروع کر دیں، لیکن انہوں نے ان تمام حالات کا عزم وہمت اور جوانمردی کے ساتھ مقابلہ کیا، اور اپنے عزائم سے شمہ بھر مفاہمت نہ کی، اور نہ کارِ دعوت سے پیچھے ہٹے، اور نہ ہی اپنی بات سے منحرف ہوئے، اللہ تعالیٰ نے ان کو پہاڑ کی سی صلابت واستقامت نصیب فرمائی تھی۔

شیخ احمد سرہندی اس وقت معاشرہ کی ایک اہم ضرورت تھے، اسلامی معاشرہ کسی ایسے صاحب عزیمت کا منتظر تھا جو اس کو متعفن حکومت کے شکنجوں سے آزاد کرا سکے اور برسر اقتدار امراء وسلاطین کے مکر وفریب سے محفوظ کر سکے، جن کی پوری توانائی دین وعقیدہ سے استہزا اور تمسخر میں صرف ہونے لگی تھی، تاکہ اسلام کی عظمت لوگوں کے دلوں سے ختم ہو جائے، اور مسلم طبقہ کی حیثیت ہندوستان میں محض ایک ذریعہ وآلہ کی ہو کر رہ جائے، جس کے ذریعہ وہاں کی حکومت اور سلطنت کے ساتھ اسلام کا نام چسپاں کیا جا سکے، جب کہ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا، اس سلسلہ میں اُن کی جرأت کا یہ حال تھا کہ انہوں نے شیخ احمد سرہندی کو چند سکوں کے عوض خریدنے کی کوشش کی، تاکہ اس طرح وہ مسلمانوں کو گمراہ کرنے اور اسلام کی غلط تصویر کشی کے لئے اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اس لئے کہ عوام کا شیخ احمد سرہندی سے تعلق اور ان کے اندر ان کی حد درجہ مقبولیت کا انہیں علم ہو چکا تھا اور اس وقت وہ مسلمانوں کے اندر بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

ایسے تاریک دور میں جب جہالت وبدتہذیبی، ظلم وسرکشی، اور مطلق العنانی وطوائف الملوکی اس حد تک پہونچ چکی تھی کہ اس سے زیادہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا اور یہی سرزمین ہند جو کبھی عقیدہ ودین کے لئے ڈھال ہوا کرتی تھی، آج نئے مذہب اور نئے عقیدہ کے اختراع وایجاد کی سازش رچنے کی تیاری میں مصروف تھی، ایسے موقع پر یہ نحیف وناتواں اور کمزور شخص بھلا اتنی بڑی حکومت اور اسلحوں کے مقابلہ میں کیا کر سکتا تھا، اور اس کی کیا مجال تھی کہ وہ ایسی حکومت اور فوج کے مدمقابل آئے، جس سے محض بزدلی اور اسلحہ وفوج کے خوف کی بنا پر عوام نے سمجھوتہ کر لیا ہو، لیکن انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ کسی بھی حالت میں اسلام کی ذلت کو برداشت نہیں کر سکتے، اور کسی بھی صورت میں اسلام کی عظمت پر آنچ نہیں آنے دیں گے، وہ اپنی نگاہوں سے یہ دیکھ رہے تھے کہ ایک ملحد بادشاہ لوگوں کو اسلام سے پھیر رہا ہے اور ان کو ان کے عقیدہ سے منحرف کر رہا ہے، اور ان کی نگاہیں یہ بھی دیکھ رہی تھیں کہ معاصر علماء اس ظالم وملحد بادشاہ کی حمایت کر رہے ہیں، اور اس کے ہر بن مو

کے اشارہ کی تائید کررہے ہیں، اور وہ اسلام کی بیخ کنی میں اس کے ساتھ برابر کے شریک ہیں، ایسا لگ رہا تھا کہ ہندوستان اور اس کے زیر فرمان ملکوں میں اسلام کی طاقت وقوت ہمیشہ ہمیش کے لئے مٹ کر رہ جائے گی، اور ایک نیا مذہب جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں اس کی جگہ لینے کے لئے منتظر کھڑا تھا، یہ دین اکبری تھا، جس کو شہنشاہ اکبر نے اپنی رعایا پر زبردستی تھوپ رکھا تھا، اس کا کہنا تھا کہ اللہ اکبر کا مطلب ہے کہ شہنشاہ اکبر ہی اللہ ہے، اور اس کے حواری و درباری اس کا اعتراف کرتے تھے، وہ اس کے آگے سر ٹیکتے اور جھکتے تھے، اور خدا کی طرح اس کے سامنے دست سوال دراز کرتے تھے، اور غلط تقلید ورسومات اور فاسد عقائد نے لوگوں کے دلوں میں گھر کرنا شروع کر دیا تھا، اور آہستہ آہستہ یہ خبریں بالکل دینی عقیدہ کی شکل اختیار کرتی جارہی تھیں۔

لیکن شیخ احمد سرہندی نے ان حالات میں دعوت اسلام کے لئے جس اسلوب کو اختیار کیا تھا وہ بڑا ہی پرکشش اور پرتاثیر اور زود اثر بھی تھا، یعنی خطوط اور مکتوبات کے ذریعہ علماء، وزراء، ارباب حکومت اور افواج تک اسلام کی دعوت کو عام کرنا، یہ مکتوبات حکمتوں اور معارف کا ایک خزانہ ہوا کرتے تھے، اور وہ اپنے پہلو میں حکمت ومعرفت کے بہت ہی دلنشین اور اعلیٰ مفاہیم سموئے ہوتے تھے، جس سے لوگوں کو روشنی ملتی تھی، اور باطل عقائد وخیالات کو دل سے نکال کر یہ خطوط ان کے دلوں کو راہ حق کی قبولیت اور عبرت وموعظت کے لئے ڈھالتے تھے۔

انہیں رسائل ومکتوبات کے ذریعہ شیخ سرہندی کی ارباب سیاست اور برسر اقتدار افراد تک رسائی ہوئی اور انہیں اس دعوت کی وجہ سے اکرام وتعظیم سے نوازا گیا، اور شیخ نے ان لوگوں کے دلوں میں سربلندی وعظمت کا مقام حاصل کرلیا، چنانچہ شیخ نے حکومت اور فوج کے ارکان سے مراسلت ومکتوب نگاری میں مزید جوش وخروش کا مظاہرہ کیا، اور اس کے نتیجہ میں ان میں سے ایک بڑی تعداد نے شیخ سے بیعت کی، اور ان لوگوں نے دل کی گہرائیوں کے ساتھ شیخ سے محبت کا ثبوت پیش کیا، اس لئے کہ انہوں نے شیخ کی دنیا

سے بے رغبتی اور توجہ الی اللہ کا قریب سے مشاہدہ کرلیا تھا، اور شیخ نے خود کو ایک ایسے مفید اور کارآمد عمل سے وابستہ کرلیا تھا، اور جس سے اس دور کے علماء ناواقف تھے۔

شیخ احمد سرہندی کے یہ مکتوبات دعوت وارشاد کا سب سے اہم ذریعہ ثابت ہوئے، اور اسی کے ساتھ وہ پوری قوت کے ساتھ دلوں پر جلد اثر انداز ہوتے تھے، کیونکہ ان میں ایمان ویقین کے اعلیٰ مفاہیم اور خوبصورت معانی پوشیدہ تھے، اور انہوں نے صفحہ قرطاس میں اپنے دل کے ٹکڑے نکال کر رکھ دیئے تھے، اور ان کے مراسلات از دل خیزد، بر دل ریزد کے مصداق ہوا کرتے تھے، اپنی اثر پذیری کی وجہ سے یہ مکتوبات واعظوں اور مخلصانہ کام کرنے والوں کے لئے ہمیشہ ہمیش ایک مرجع کا کام دیں گے، اور حق کے متلاشیوں اور سلوک ومعرفت کے جادہ پیما سالکین کیلئے رہبر ثابت ہوں گے۔ اسی طرح یہ خطوط اسلام کے علمی سرمایہ اور کتب خانوں کے لئے بھی زینت کا باعث ہوں گے، شیخ کے یہ مکتوبات فصیح وبلیغ فارسی زبان میں تین ضخیم جلدوں میں موجود ہیں، اپنے ایک مکتوب میں وہ رقم فرماتے ہیں:

واویلا، وامصیبتاہ، واحزناہ، واحسرتاہ، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے (جو محبوب رب العالمین ہیں) ماننے والے ذلیل وخوار ہیں، اور آپ کی نبوت کا انکار کرنے والے باعزت وبااعتبار، باطل نمایاں اور کامیاب ہے، اور حق روپوش ومستور۔

ایک دوسرے مکتوب میں فرماتے ہیں:

''قرن ماضی (عہد اکبری) میں اہل اسلام کے سر پر سے کیا مصیبت گذر گئی، اس سے پہلے کی صدیوں میں غربت اسلام کے باوجود اہل اسلام کی ذلت وخواری اس سے زیادہ نہ ہوتی تھی، اس زمانہ میں زیادہ سے زیادہ یہ تھا کہ مسلمان اپنے دین پر رہیں اور اہل کفر اپنے طریق پر، ''لکم دینکم ولی دین'' لیکن قرن ماضی میں اہل کفر غالب آکر برملا دارالاسلام میں احکام کفر کا اجراء کرتے تھے اور مسلمان اسلام کے احکام کے اظہار سے بھی مجبور تھے، اگر کوئی ہمت بھی کرتا تھا تو موت کی سزا پاتا تھا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والے ذلیل وخوار تھے، اور آپ کی نبوت کا

انکار کرنے والے باعزت وبااختیار مسلمان اپنے زخمی دلوں کے ساتھ اسلام کی نوحہ خوانی میں مصروف تھے، اور معاندین تمسخر واستہزاء کے ساتھ ان کے زخموں پر نمک پاشی کرتے تھے، آفتاب ہدایت گمراہی کے پردہ میں مستور اور نور حق باطل کے حجابات میں مخفی وروپوش تھا، سنت کی پیروی کے وہ دلدادہ اور بدعات سے سخت متنفر تھے، اور سنت مطہرہ سے میل نہ کھانے والی چیزوں سے سخت اجتناب کرتے تھے، اور انہوں نے اپنے کو عادی بنالیا تھا اور وہ ہر حالت وہر آن سنت ہی کی اتباع کرتے تھے، یہاں تک کہ ان کا کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، اور سونا جاگنا، مطابق سنت ہی ہوتا، پوری عمر نہ ان کا کوئی عمل خلاف سنت دیکھا گیا اور نہ ہی کوئی قول پایا گیا، ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے کہ ایک بار انہوں نے ایک لونگ مانگی، جب وہ چھ عدد لونگ لیکر آیا تو ان کو یہ ناگوار گزرا جس کا اثر چہرے پر ظاہر ہونے لگا، اور انہوں نے افسوس کے ساتھ کہا کہ ہمارے ساتھی کو اب تک معلوم نہ ہوسکا کہ وتر کی رعایت سنت ہے، ان اللہ وتر ویحب الوتر، فرمایا جب میں وضو کرتا ہوں تو میں سنت کی پیروی کے خیال سے چہرے کا داہنا حصہ پہلے دھوتا ہوں اس لئے کہ تیامن سنت ہے۔"

انہوں نے اپنی پوری زندگی دعا وعبادت، دعوت وارشاد اور سنت ونوافل اور تلاوت وذکر کی دعوت دینے اور اس کے لئے لوگوں کو آمادہ کرنے پر گزاری، رات میں وہ بہت کم سوتے تھے، ہر روز آدھی رات کو بیدار ہوجاتے، اوراد ونوافل، دعا، عبادت اور توبہ وانابت اور ذکر واذکار میں صبح تک مشغول رہتے، وہ فقراء ومساکین کی دلداری بھی کرتے اور چاشت کے بعد ان کو کھانا تقسیم کرتے، اور ہر روز ان کے دسترخوان پر تقریباً سو علماء وصلحاء اور حفاظ شریک ہوتے تھے، اور جب بھی کوئی مال آتا تو اس کے ایک حصہ کو مستحقین پر صرف کرتے تھے، وہ حقوق العباد کی ادائیگی کا بڑا اہتمام کرتے تھے، مریضوں کی عیادت ومزاج پرسی، نماز جنازہ میں شرکت، اہل اولاد ومریدین کی تربیت وپرورش کی ذمہ داری بہتر طریقہ سے انجام دیتے تھے، اور احسن طور پر اپنے واجبات وحقوق کو پورا کرتے تھے، اور وہ عوام کے افادہ کے لئے درس وتدریس اور افتاء نویسی وغیرہ بھی کیا کرتے تھے۔

اس وقت کے بادشاہ جہانگیر کی شیعیت نوازی اور کشادہ قلبی کی وجہ سے اس ملک میں شیعی عقائد بہت تیزی سے پھیلنے لگے تھے، بادشاہ کے اس رویہ کی وجہ سے شیعہ ان کی جانب متوجہ ہوگئے، اور فاسد عقائد کی اشاعت میں بادشاہ کا ساتھ دینے لگے، شیخ سرہندی نے ان کے باطل عقائد کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، اور ان کے مکر وفریب کے پردوں کو چاک کر کے حقائق کو سامنے لائے اور ان کی ان بنیادوں پر پرزور حملہ کیا جو وہ دین اسلام کی تعلیمات کو مٹانے اور الحاد وفسق کی اشاعت کے لئے کیا کرتے تھے، اس چیز نے شیعوں کے غصہ کو بھڑکا دیا، اور وہ لوگ بادشاہ سے ان کی چغل خوری کرنے لگے، یہاں تک کہ انہوں نے بادشاہ کو شیخ کے قید کرنے پر مجبور کر دیا، چنانچہ بادشاہ نے انہیں قید خانہ میں ڈال دیا، اور وہاں انہوں نے دو سال گذارے، لیکن وہاں بھی وہ قیدیوں کو اسلام کی دعوت دیتے رہے، یہاں تک کہ سیکڑوں بت پرست قیدیوں نے قید خانے کے اندر ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔

پروفیسر آرنلڈ اپنی کتاب "Preaching of Islam" میں تحریر کرتے ہیں:

''ہندوستان میں (عہد جہانگیر یعنی ۱۶۰۵م سے ۱۶۳۸م تک) ایک اہلسنت عالم گزرا جس کو شیخ احمد سرہندی مجدد کہا جاتا ہے، خاص طور سے وہ شیعی عقائد کے رد میں معروف تھا اور چونکہ شیعہ ارباب حکومت کے نور نظر تھے، ان کی خواہش ہوئی کہ شیخ احمد کو قید کر دیا جائے، اور ان کی یہ آرزو بر آئی جب جہانگیر نے انہیں قید خانہ میں ڈال دیا، وہ دو سال اس میں رہے اور قیدیوں کو دعوت اسلام دیتے رہے، یہاں تک کہ سینکڑوں بت پرستوں نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔''

مذہب واخلاق کی ''دائرۃ المعارف'' & Encyclopeadia of Religion Ethicks میں دعوت اسلام کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے تحریر کیا گیا ہے:

''سترہویں صدی مسیحی میں ہندوستان کے اندر ایک عالم دین گذرے ہیں جن کا نام شیخ احمد مجدد تھا، ان پر ظلم وجور کرتے ہوئے قید کر دیا گیا وہ قید خانہ میں بھی بت پرست قیدیوں کے ساتھ اسلام کی تبلیغ کرتے رہے، یہاں تک کہ جن لوگوں نے

وہاں اسلام قبول کیا، ان کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہے۔"

کبھی انہیں فکر معاش نے پریشان نہ کیا، جب کہ انہوں نے دنیا کے سب سے بڑے بادشاہ شہنشاہ اکبر کا زمانہ پایا، جس نے مختلف بہانوں سے انہیں راضی کرنے کی کوشش کی، لیکن شیخ نے شدت سے ہر چیز کا انکار کر دیا، شیخ نے اکبر کے اس اقدام پر سخت تنقید و مذمت کی، کہ اس نے خلاف اسلام امور کو جواز کا پروانہ عطا کر دیا تھا۔

شیخ احمد سرہندی نے صاف ستھری زندگی گزاری، اس میں دنیا کی کوئی گندگی داخل نہ ہونے دی، انہوں نے مکمل دنیا سے بے رغبتی برتی، اور صرف اللہ اور آخرت کی جانب جسم و جان سے متوجہ رہے، انہوں نے اپنے کردار سے ثابت کر دیا کہ انسان کے اس دنیا میں رہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ آخرت کے لئے زادراہ تیار کرے، اور آج ہی کل کے لئے سامان سفر تیار رکھے جو اس کو ابدی فلاح و کامرانی سے ہمکنار کرے، جس سے بڑھ کر کوئی فلاح و سرخروئی نہیں ہے۔

شیخ احمد تو آخرت کی طرف چلے گئے، لیکن انہوں نے اپنے جہد و عمل کا ایک ایسا سلسلہ چھوڑا ہے، جس سے امت اسلامیہ نے بہت فائدہ اٹھایا اور ہمیشہ ہمیش یہ فائدہ قائم و دائم رہے گا، شیخ احمد کے بعد بے شمار لوگ ان کے سلسلہ سے فیضیاب ہوئے، ان کا سلسلۂ تصوف جس کو سلسلۂ چشتیہ کے نام سے جانا جاتا ہے بہت پر تاثیر ہے، ہندستان میں کسی بھی سلسلہ کو اتنی مقبولیت نہیں حاصل ہوئی، یہ سلسلہ پورے عالم اسلام میں ترکی کے اطراف سے لیکر مشرق کی سرحدوں اور مغرب اقصیٰ وغیرہ تک پھیلا، جیسا کہ محمد بن عبدالرحمٰن الفاسی نے اپنی کتاب میں "المنح البادیة" میں تحریر کیا ہے، اور شیخ خالد کردی ان کے خلفاء میں سے تھے، جن کے ذریعہ یہ سلسلہ عالم اسلام مثلاً عراق و شام میں پھیلا۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو چار اولاد عطا کی تھیں جو سب کے سب اولیاء اللہ ہوئے، اور ان لوگوں کے ذریعہ ایسی ایسی کرامتیں ظاہر ہوئیں جن سے عقل ششدر رہ جاتی ہے، ان لوگوں کے ذریعہ بہت سے لوگوں کو ہدایت ملی، خاص طور سے ان کے تیسرے بیٹے شیخ محمد

معصوم معرفت وکمال اور للّٰہیت کے ایسے بلند مقام پر فائز ہوئے کہ کہا جاتا ہے کہ ان کے مریدین نولاکھ سے زائد تھے۔

ان کی بیشمار تصنیفات ہیں جو علوم ومعارف اور حقائق ورموز سے پر ہیں، خاص طور سے ان کے وہ مکتوبات جو تین جلدوں میں ہیں، ان کا شمار فصیح وبلیغ اور دلوں پر گہرا اثر ڈالنے والے مکتوبات میں ہوتا ہے۔

یہ اس طاقتور مومن شخصیت کی زندگی کی ایک جھلک ہے جس پر بجا طور پر عالم اسلام کو فخر حاصل ہے۔

تفصیل کے لئے ملاحظہ کریں۔

- Preaching of Islam
- Encyclopeadia R. E.
- تاریخ دعوت وعزیمت
- المنح البادیہ
- حضرت مجدد اور ان کے ناقدین ابوالحسن زید فاروقی
- اکبر کا دین الٰہی سعید احمد اکبر آبادی

شیخ محمد معصوم سرہندی

(۱۰۰۷ھ-۱۰۷۹ھ)

میرے لئے یہ بڑی سعادت کی بات ہے کہ شیخ احمد سرہندی کے بعد میں ان کے فرزند ارجمند شیخ محمد معصوم سرہندی کے بارے میں گفتگو کروں، شیخ معصوم ایمان وعمل کے گہوارہ اور صلاح وتقویٰ کی فضا میں پروان چڑھے، ان کی پرورش ایک صالح نوجوان کی حیثیت سے ہوئی جس کا اللہ تعالیٰ سے مستحکم ربط تھا اور ان کے والد نے ان کی پرداخت ایک بڑے عارف باللہ کی طرح کی، جن سے بہت سے لوگ فیضیاب ہوئے اور لوگوں نے ان کے ہاتھوں ایمان واسلام پر بیعت کی۔

شیخ معصوم مجدد الف ثانی کے ایک نیک فرزند تھے لوگوں نے ان کو ''العروۃ الوثقیٰ'' کا لقب دیا، اس لئے کہ وہ حقیقتاً عروہ وثقیٰ (قابل اعتماد شخص) تھے۔ ایمان وتقویٰ، معاشرہ کی اصلاح اور تزکیہ قلوب وغیرہ میں اپنے والد کے جانشین تھے۔ اس طرح انہیں ہزاروں افراد تک ان کے پیغام کو عام کرنے کا موقع ملا، انھوں نے بہت سے گم کردہ راہ اور جادہ حق سے ہٹے ہوئے لوگوں کے لئے شاہراہ عمل واضح کی، ایک ایسے زمانہ میں جب کہ لوگ حضورؐ کے پیغام وتعلیمات کو بھلا چکے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کو فراموش کر بیٹھے تھے۔ انہوں نے اتباع سنت کی دعوت دی اور احیاء سنت کا فریضہ انجام دیا، اور انہوں نے اس کے لئے ہر میدان میں پیش قدمی کی، وہ امراء وسلاطین سے بھی ملے۔ اور علماء وشیوخ سے بھی ملاقاتیں کیں، اور اپنے دور کی ہر شخصیت خواہ وہ بادشاہ ہو یا شہنشاہ،

علماء ومشائخ ہوں یا عام لوگ ہر ایک کو دعوت دی اور اپنی دعوت، اخلاص و جہاد اور نصیحت کا ایک گہرا نقش ان کی شخصیت پر قائم کیا۔

یقیناً وہ شیخ احمد سرہندی کے چھوڑے ہوئے ایمانی ورثہ کے سچے وارث اور ان کے راز سربستہ کے راز داں تھے، اللہ تعالیٰ نے علوم ومعارف خداوندی کے بیان کے لئے ان کا سینہ کھول دیا تھا، جو انسان کو خالق سے ملاتی ہے اور اس کو اپنے سے قریب کرتی ہے۔اور معاشرہ میں واقع ہونے والے ہر فساد وبگاڑ کی اصلاح میں نصف صدی تک مصروف عمل رہے۔حیات انسانی اور علوم الٰہی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں چھوڑا جہاں انہوں نے آبلہ پائی نہ کی ہو۔اور انہوں نے زندگی ومعاشرے کے اندر پھیلی ہوئی ہر بدعت کا قلع قمع کیا۔اور ہر اس بدعت کو ختم کیا جس میں ہر خاص وعام ملوث تھا۔

شیخ معصوم سرہندی ۱۱ رشوال المکرم ۱۰۰۷ھ میں دوشنبہ کے دن پیدا ہوئے تھے۔ان کی ولادت شیخ احمد سرہندی کے لئے ایک نئے عہد کا آغاز کا سبب بنی، اس لئے کہ انہوں نے شیخ معصوم کی ولادت کے بعد ایسے علوم کی تحصیل پر توجہ کی۔جو احسان وسلوک کی راہ میں ان کی رفعت وسربلندی کا زینہ ثابت ہوئے۔

ایک موقع پر وہ خود فرماتے ہیں:

''شیخ معصوم کی ولادت نے میری زندگی میں سعادت وبرکت بھردی، ان کی ولادت کے چند ماہ بعد اللہ تعالیٰ نے مجھے توفیق بخشی کہ میری ملاقات خواجہ باقی باللہ سے ہوئی، میں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی، اور بس اللہ تعالیٰ نے مجھے انہیں سے روحانی علوم اور تقرب الی اللہ کے حصول کی توفیق عطا فرمائی''۔

عہد طفولیت سے ہی وہ اپنے والد کی مجلسوں میں شریک ہوتے تھے اور ان کے مواعظ وارشادات سے متمتع ہوتے تھے، وہ ان کو بغور سنتے ان پر عمل کرتے، اور اس کے ساتھ اپنی زندگی کو ڈھالتے تھے، خواجہ محمد ہاشم اپنی کتاب ''زبدۃ المقامات'' میں شیخ احمد سرہندی کے قول کو نقل کرتے ہیں۔

''خواجہ محمد معصوم ہماری نسبت اور طریقت سے استفادہ کرنے میں شرح الوقایہ کے مصنف صدر الشریعہ کے مماثل ہیں، جس طرح شرح وقایہ کے مصنف اپنے دادا کی تالیف کردہ کتاب کو بغیر کسی تاخیر کے یاد کر لیتے تھے، اسی طرح خواجہ محمد معصوم ہمارے سلوک وطریقت سے بغیر کسی تاخیر کے مستفید ہوتے رہے۔ شیخ مجدد اپنے بیٹے شیخ معصوم سے کہا کرتے تھے'' اے بیٹے تجھی سے آس لگائے بیٹھے ہیں اور بہت سے اہم کاموں میں تمہاری خدمت کی ضرورت مند ہیں۔ اس لئے ہم تعلیم سے تمہاری فراغت کے منتظر ہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے ان کے والد کی اس آرزو کی تکمیل فرمائی، شیخ محمد معصوم علوم عقلیہ اور علوم نقلیہ میں صرف سولہ سال کی عمر ہی میں فائق ولائق ہوگئے، اور اس کے بعد محض تین ماہ کے اندر انہوں نے قرآن مجید کو حفظ کیا، اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے والد کی نگہداشت میں ان معارف ربانی کے حصول کا زریں موقع عنایت فرمایا تھا۔ وہ تھوڑے سے عرصہ میں ہی سلوک ومعرفت کے مراحل طے کرنے پر قادر ہوگئے، اور اصلاح اقوال اور لوگوں کی رہنمائی کے لئے خلعتِ اجازت وخلافت سے بھی وہ سرفراز ہوئے۔

۱۰۳۴ھ میں جب مجدد صاحب اللہ کو پیارے ہوگئے تو ان کا منصب ارشاد واصلاح انہیں کو ملا اور وہ ان کے تمام امور کے خلیفہ وجانشین قرار پائے، چنانچہ ہر طبقہ کے لوگ ان سے استفادہ کرتے تھے اور لوگوں کے لئے ان کی کشادہ قلبی، وسعت نظری، پختگی رائے اور ان کے علوم وکردار بڑے کارآمد ثابت ہوئے اور لوگوں نے ان سے بڑا فیض اٹھایا اور امراء وسلاطین، علماء ومشیوخ اور ارباب حکومت وسیاست اور عام وخاص میں سے کوئی بھی باقی نہ بچا جس نے اس سرچشمہ سے سیرابی نہ کی ہو، اور اس روحانی گھاٹ کا اس نے پانی نہ پیا ہو، اور ہر ایک نے ان کے علوم ومعارف کے فضل کا اعتراف کیا۔

یہ تاریخ کا نادر واقعہ ہے کہ تین مغل حکمراں اپنے عہد حکومت میں ان کے پاس پے در پے بیعت کے لئے حاضر ہوئے، یعنی جہانگیر، شاہ جہاں اورنگ زیب، انہوں

نے ایمان واخلاص عمل اور عبادت وطاعت پر ان سے بیعت کی، خاص طور سے اورنگ زیب شیخ محمد معصوم کا شاگرد تھا، انہوں نے بچپن میں ان کو تعلیم دی تھی ان کی تدریس وتعلیم نے اورنگ زیب کے دل پر بڑا گہرا اثر چھوڑا، اور شاید یہی چیز سبب بنی کہ اموال واسباب اور عیش وتنعم کے گہوارہ میں پروردہ یہ ولی عہد ایک زاہد وصوفی کی طرح پروان چڑھا، اور جب وہ شہنشاہ کے مرتبہ پر فائز ہوا تو اس نے تمام امور کی اصلاح اور نظام حکومت کو شریعت اسلامی کے مطابق چلانے کی جانب پیش قدمی کی، اور وہ اس میں کامیاب ہوئے اور انہوں نے نظام حکومت میں بہت سی اصلاحات کیں، اور انہوں نے عظیم الشان کارنامے انجام دیئے جن کی انجام دہی سے دیگر مغل حکمراں قاصر رہے، بلکہ صرف مغل حکمراں ہی نہیں بلکہ دنیا کا کوئی شہنشاہ ان کے بعد ان جیسے کارنامے انجام نہ دے سکا۔

شیخ مراد اپنی کتاب ''ذیل الرشحات'' میں خواجہ محمد معصوم کی عظمت اور مقامات تصوف میں ان کی سربلندی کے سلسلہ میں رقم طراز ہیں:

''وہ اپنے والد ماجد کی طرح اللہ کی ایک نشانی تھے، انھوں نے پوری دنیا کو نور سے بھر دیا، اور اپنی کوششوں سے جہالت اور بدعات پر کاری ضرب لگائی اور ان کی صحبت کی گرمی سے ہزاروں لوگ محرم راز بن گئے، کہا جاتا ہے نو لاکھ لوگوں نے ان کے دست حق پرست پر بیعت کی اور ان کے خلفاء کی تعداد سات ہزار ہے، جن میں ایک اہم شخصیت شیخ حبیب اللہ بخاری کی ہے جنہوں نے خراسان اور ماوراء النہر کے علاقہ میں احیاء سنت اور بدعات کے خاتمہ کے لئے عظیم ترین کارنامے انجام دئے، اور چار ہزار لوگوں کو اپنے حلقۂ ارادت میں داخل کیا۔''

ان ناموں کی ایک طویل فہرست ہے جنہوں نے ان کے چشم صافی سے فیض اٹھایا اور زندگی میں بڑے بڑے مراتب حاصل کئے شیخ محمد معصوم سے ان کا استفادہ کرنا اس زمانے کے پورے معاشرہ پر اثر انداز ہوا اور اس نے مسلمانوں کی زندگیوں پر گہرا اثر ڈالا۔ ان کے والد نے بڑی بڑی شخصیات سے مراسلت کی تھی جو معاشرہ کے اندر اثر ورسوخ کے

مالک اورعوام الناس میں مقبول ومشہور تھے، یہ مکتوبات بلند مفاہیم پر مشتمل ہوتے تھے، ان میں عقائد وکلام، عبادت ومعاملات اوراحسان وتقویٰ کے مقام پر سیر حاصل روشنی ڈالی جاتی تھی، تزکیہ نفس، تہذیب اخلاق اور خدا سے نیک اعمال کے ذریعہ تعلق اور ہر عمل میں خلوص نیت وغیرہ کے متعلق مضامین ہی ان مکتوبات کی زینت بنتے تھے۔

یہ چند سطریں شیخ محمد معصوم کے بارے میں تھیں، جنہوں نے ہندستان اور عالم اسلام کے اندر ایک صالح اسلامی معاشرہ کی تعمیر میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا، اوران کی مساعی ایسی سوسائٹی کی تعمیر میں صرف ہوئیں جس سے ایمان وطاعت، زہد وورع، ایثار وقربانی کی فضا پیدا ہوئی اور پوری سوسائٹی کلمہ اسلام کی بنیادوں پر چل پڑی، اوراس نے کفر اور بدعات ومنکرات سے معاشرہ کو پاکیزہ وصاف کرایا۔

تفصیل کے لئے ملاحظہ کریں۔

- مکتوبات خواجہ محمد معصوم سرہندی
- العروۃ الوثقیٰ
- ذی الرشحات
- تاریخ دعوت وعزیمت
- حقیقت الحقائق معرفۃ اللہ

خواجہ محمد معصوم کا ایک رسالہ

حقیقة الحقائق معرفة اللّٰہ

حقیقت کے متلاشی اور صورت وظاہر سے بے پروا، حقیقت پسند اور مظاہر سے متنفر شخص کے لئے تیار کیا گیا ایک مفید واہم رسالہ۔

اس سے قبل میں شیخ معصوم سرہندی کی جہد وعمل اور جاں کنی وتن فروشی کے چند روشن پہلوؤں کو اجاگر کر چکا ہوں، ان کی پوری زندگی ہندستانی معاشرہ میں دعوت اسلام کی اشاعت اور اس کے تبلیغ کے لئے گذری، اور انہوں نے اپنی حیات کے تمام قیمتی لمحات دلوں کے اندر ایمان کو جاگزیں کرنے اور سارے جہاں میں اعلاء کلمۃ اللہ میں صرف کیا، اس لئے اس عظیم ہستی کی ان مساعی کی بنا پر ہندستانی معاشرہ ان کا رہین منت اور گراں بار ہے، انہوں نے دلوں میں حرارت ایمانی پیدا کی اور ایک دل سے دوسرے دل میں، ایک جان سے دوسری جان میں ایمان کے شعلہ کو بھڑکایا، اس سرزمین پر ایمان واخلاص کی باریابی کا سہرا خدا کے حکم سے انہیں کے سر جاتا ہے، اور ان کی اس جدوجہد کے نتائج ہمیشہ دلوں میں حمیت وغیرت کے شعلے بھڑکاتے رہیں گے، اور دلوں کی سرد بھٹی میں وہ روشنی وچنگاری پیدا کرتے رہیں گے۔

شیخ محمد معصوم نے معاشرہ کی اصلاح دلوں کے سدھار اور تربیت نفس کے لئے جو کارنامے انجام دیئے اس کے طریقہ کو انہوں نے اپنے والد شیخ احمد سرہندی کے ان مکتوبات سے سیکھا تھا جن کو وہ اعیان مملکت وسلاطین حکومت، اہل علم ودین کے پاس بھیجا

کرتے تھے، یہ خطوط دولت علم کے بے بہا خزانہ اور مفید مواد کے ساتھ بلند مفاہیم سے بھرے ہوئے ہوتے تھے، اور زمانہ کے گزرنے کے باوجود جس کی قدر و قیمت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے یہ خطوط انتہائی نازک ترین دینی موضوعات اور علمی مباحث سے بحث کرتے ہیں، اور زندگی کی بیشتر مشکلات کے حل پیش کرتے ہیں، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی عظمت ان کے پیغام کی اہمیت اور خود ان کی شان امتیازی کو ظاہر کرتے ہیں، اور ان میں دین اسلام کی قیمت وقدر کو آشکارا کیا گیا ہے جو تمام مذاہب وشریعت کا خاتم اور اس سے پہلے کی تمام اقوام وملل اور شریعتوں کا ناسخ ہے۔

اس وقت ہم قارئین کے سامنے ایک رسالہ پیش کررہے ہیں، جس میں ایمان ومعرفت کی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے، اور اس حسن نیت، اصلاح قلب اور زہد نفس کے ساتھ اعمال کی پائیداری پر بحث کی گئی ہے جو شریعت کو اپنے متبعین سے مطلوب ہے اور جس کا ایمان خالص اپنے مومنوں سے مطالبہ کرتا ہے۔

شیخ حقیقی معرفت کے سلسلہ میں گفتگو کرتے ہیں اور اس کو تفصیل کے ساتھ واضح کرتے ہیں جو عیش ومحبت کی سرمستی پیدا کرتی ہے، اور وہ انسان کے اندر محبت وجذبات کی چنگاری روشن کرتی ہے، شیخ احسان وسلوک کے معانی پر نظر دوڑاتے ہیں تو اسے دل کی گہرائیوں تک اتار دیتے ہیں فرماتے ہیں، اس زندگی کا مقصد حقیقی معرفت کا حصول ہے، معرفت کی دو قسمیں ہیں، (۱) وہ معرفت جس کی بظاہر شرح کرتے ہیں۔ (۲) وہ معرفت جس کے وصول سے صوفیہ اور عارفین دوسروں سے ممتاز ہوتے ہیں۔

پہلے کا تعلق ظاہر اور طرق استدلال سے ہے لیکن دوسرے کا تعلق کشف شہود سے ہے، پہلی قسم علوم کا احاطہ کرتی ہے اور تصور ودانشمندی سے بحث کرتی ہے اور دوسری حال کے دائرہ میں پائی جاتی ہے، اور وہ حقیقت وشہود سے بحث کرتی ہے۔ معرفت کی پہلی قسم میں عارف کے وجود کی قدر نہیں ہے، اور اس کا تعلق خود سے منقطع نہیں ہوتا ہے، لیکن دوسری قسم میں عارف کا وجود ضروری ہوتا ہے اور وہ اپنی ذات میں فنا ہوجاتا ہے، پہلی قسم کا تعلق علوم

نظری سے ہے جو جہد وعمل اور اجتہاد واکتساب سے حاصل ہو جاتا ہے، لیکن دوسری کا حضور ومشہور کے علم کے کوئی متعلق نہیں ہے اس میں عارف ہر چیز سے کٹ جاتا ہے، اور عشق الٰہی میں وہ فنا ہو جاتا ہے۔ معرفت کی پہلی قسم ذاتی کشمکش اور انکار ذات سے پائی جاتی ہے، اس لئے کہ نفس گھٹیا صفات سے متصف ہوتا ہے اور وہ تمرد وسرکشی کے دائرہ سے جلد نکل نہیں پاتا ہے، اس لئے ایسی حالت میں ایمان ظاہری ایمان ہے اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے اور اس قسم میں اعمال صالحہ میں بھی صورت یہی ہوتی ہے حقیقت کا پتہ نہیں ہوتا اسی وجہ سے ایسی حالت میں انسان کا نفس عیوب ونقائص سے خالص نہیں ہوتا ہے اس لئے غیر شعوری طور پر وہ اکثر اوقات معصیت خداوندی میں ملوث رہتا ہے، اس ایمان کو ایمان مجازی کہا جاتا ہے، جو نقص وکوتاہی سے بری ہوتا ہے اور انسان کے اثرات کے زائل ہونے سے محفوظ نہیں رہ پاتا ہے۔

معرفت کی دوسری قسم عارف کو بہتر بناتی ہے وہ اس کو فنا فی اللہ کرتی ہے، اور اس کے لئے اصل اسلام کو اور عارف باللہ وصوفی اس مرحلہ میں ایمان اور عمل صالح کی حقیقت اس پر آشکارا ہوتی ہے۔ اور حقیقت کسی بھی حالت میں دلوں سے محو نہیں ہوتی۔ اور اس کے اثرات ہمہ وقت قائم ودائم رہتے ہیں، اسی حقیقت کی جانب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے "یا ایھا الذین آمنوا آمنو"۔

امام احمد بن حنبل اسی حقیقی ایمان کے طلب گار تھے اسی وجہ سے وہ بشر الحافی سے بیعت پر مجبور ہوئے انہوں نے شیخ کو اپنا مرشد بنایا اور ان کے کاروان علم وعزیمت میں ایک شاگرد حقیر کی طرح شامل ہو گئے اور وہ خادم کی طرح ان کی خدمت کرتے تھے جب کہ خود بہت بڑے منصب بردار اور علم وتفقہ اور اجتہاد کے اعلیٰ درجہ پر فائز تھے۔

ان سے اس کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا، کہ بشر الحافی، احمد بن حنبل سے زیادہ اللہ کو جاننے والے ہیں۔

یہ امام ابوحنیفہ جنہیں ساری دنیا امام اعظم کے نام سے جانتی ہے، بحث وتحقیق

اور فقہ واجتہاد کی اسی حالت پر باقی رہنے سے ان کو تشفی نہیں ہوئی جب کہ وہ علم کے اعلیٰ مرتبہ، اور زہد وتقویٰ، خشیت وانابت کے درجہ کمال پر متمکن تھے، لیکن خدا تعالیٰ تک رسائی کے لئے وہ ان چیزوں کو ناکافی خیال کرتے تھے، اس لئے اپنی عمر کے آخری دوسالوں میں وہ معرفت الٰہی اور اس سے محبت وعشق کی کلید تلاش کرنے لگے اور انہوں نے اپنے ان دوسالوں کی اہمیت وقیمت کا کھل کر اعتراف کیا اور فرمایا کہ "لو لا السنتان لهلك النعمان" "اگر یہ دوسال نہ ملتے تو نعمان تباہ ہو جاتا۔"

کس کو نہیں معلوم کہ امام ابوحنیفہ ایک عالم باعمل تھے، اور اس میں وہ بلند مرتبہ پر فائز تھے، اور کیا دین میں اجتہاد وتفقہ سے بڑھ کر کوئی درجہ ہو سکتا ہے اور علوم دین کی تعلیم وتدریس سے بڑھ کر بھلا کوئی طاقت ہو سکتی ہے؟ لیکن انہوں نے ان میں سے کسی کی پروانہ کی اور اس میں ان کو اپنے مقصد کی تکمیل نظر نہ آئی، اس لئے انہوں نے معرفت الٰہی اور قلب وروح کے ساتھ اس کے سائے میں حاضری کے لئے اس کے مراحل طے کرنے شروع کر دیئے۔

معلوم ہونا چاہئے کہ خدا تعالیٰ کے نزدیک اعمال کی قبولیت جب ہوتی ہے جب ایمان ہر پہلو سے کامل ومکمل ہو، اور وہ حقیقی طور پر انسان کے اندر راسخ ہو اور اس کی بشاشت انسان کے دل میں داخل ہو، تب اعمال خالصہ اللہ تعالیٰ کو محبوب اور مقبول بارگاہ ہوں گے۔

خالص معرفت کے لئے ایمان واخلاص کا کامل ہونا شرط اولین ہے، اور معرفت حب الٰہی میں فنا ہونے سے مربوط ہوتی ہے، اس لئے جو فنائیت میں عشق الٰہی میں جتنا راسخ ہوگا اتنا ہی ایمان میں کامل ہوگا، اس لئے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ایمان تمام امت اسلامیہ کے ایمان سے راسخ ہے، اس لئے کہ اندر سے پہلو میں فنائیت اور عشق الٰہی کے ایسے شعلے بھڑکتے تھے، کہ کسی دوسرے کو وہ حاصل نہیں اور ان کی نظیر پیش کرنے سے دوسرے لوگ قاصر ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ہر شخص ان مفاہیم کے لئے خبردار رہے اور صدق وخلوص کے ساتھ وہ اپنے حقیقی مقصد پر مقرر کرے، اللہ تبارک تعالیٰ نے جس کو بھی معرفت وعلم کی اس قسم سے نوازا ہے وہ ہر تہنیت ومبارک باد کا مستحق ہے، اور یقیناً وہ عظیم مقصد تک پہونچ گیا ہے، اور اس نے ایمان ویقین کی اصل زندگی کو پالیا ہے، اور عبادت وانابت میں اس کی زندگی بسر ہورہی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، "وماخلقت الجن والانس إلا ليعبدون" اس آیت میں عبادت سے مراد معرفت کاملہ ہے، جو انسان کو اپنے رب سے ملاتی ہے اور نفس کو مادی وساوس اور کمزور دنیوی بندھنوں سے آزاد کرتا ہے، اور اس کے تعلق کو ذات باری سے مربوط کراتا ہے، جس نے ساری کائنات کو پیدا کیا، اور اس کی تقدیر مقرر کی۔

میں اس معرفت کے ہر متلاشی کو وصیت کرتا ہوں کہ وہ اس کے حصول کے لئے ان تمام صلاحیتوں اور توانائیوں کے ساتھ سخت جدوجہد کرے اور اس راہ میں اپنی سب سے قیمتی متاع کو صرف کرنے سے بھی دریغ نہ کرے اور جہاں سے بھی اس کا حصول ممکن ہو اس کے لئے جلدی کرے۔

افسوس ہے اس شخص پر جو اس فانی زندگی میں اپنے مطلوب ومقصود کے حصول کے لئے تگ ودو نہیں کرتا اور وہ معمولی مسائل میں گھرا رہتا ہے جن کی خدائی نگاہ میں کوئی وقعت نہیں ہے لیکن اس نے حقیقی مقصود کو حاصل نہیں کیا، جو بھی اس سلسلہ میں کوتاہی کرتے ہیں میں قیامت کے دن ان کے حساب سے ڈرتا ہوں کاش میں جان پاتا کہ وہ کل خدا کے سامنے کون سا عذر پیش کریں گے۔

سلطان اورنگ زیب عالمگیرؒ

(۱۶۵۷ء--۱۷۰۷ء)

اس وقت میرا موضوع گفتگو کوئی ایسا صوفی اور عارف باللہ نہیں ہے، جو دنیا سے کٹ کر کسی خانقاہ کا ہو کر رہ گیا ہو اور اس نے اس کو اپنی دعوت وارشاد کا مرکز بنالیا ہو، اور نہ ہی کسی ایسے بادشاہ کی زندگی میں سپرد قلم کرنے جارہا ہوں، جس نے اپنی دنیا کے لئے آخرت سے قطع تعلق کرلیا ہو، اور اس نے اپنا ایک تخت سلطنت بنالیا ہو اور ایک شہنشاہ اور امپائر کی طرح وہ اس پر جلوہ افروز ہو، بلکہ میری گفتگو کا موضوع بنی نوع انسان کی لڑی کا وہ قیمتی موتی ہے، اسلامی تاریخ میں جس کا نام سنہرے حروف سے رقم ہے، اور اس کی پوری زندگی ایک درس عبرت اور تگ وتاز کی زندگی تھی، اس نے تن تنہا ایسے اہم امور انجام دیئے جن کا پوری پوری جماعت کے لئے انجام دینا مشکل ہوتا ہے، اور دنیا کے سامنے ایک ایسی مثال قائم کردی جس سے عقل حیرت زدہ رہ جاتی ہے اور تاریخ میں ایک ایسا نمونہ پیش کردیا جو زندگی کا سب سے نادر ونایاب نمونہ ہوسکتا ہے، یہ شخصیت سلطان اورنگ زیب عالمگیرؒ کی تھی، جو گیارھویں صدی عیسوی کا سب سے عظیم شہنشاہ تھا۔

ان کی زندگی کا ایک معروضی مطالعہ ہمارے سامنے ہشت پہل نگینہ کی طرح ان کی زندگی کے مختلف دلکش زاویئے پیش کرتا ہے جس کا ہر پہلو اہم بھی ہے اور باعظمت بھی، وہ ایک بڑا عالم تھا، اس مرتبہ پر متمکن تھا جہاں تک بڑے بڑے علماء بمشکل پہونچتے

ہیں، وہ عارف وسالک تھا جس نے زندگی کے حقیقی راز کو پالیا تھا اور پوری زندگی کو احکام خداوندی کے تابع کردیا تھا۔ وہ ایک صوفی تھا جس نے تصوف ومعرفت کے مفہوم کو ذہن نشین کرکے اس کی بلند وبالا چوٹیوں کو سر کیا، اور ان تمام خصوصیات کے ساتھ ساتھ وہ اپنے زمانہ کا بہت بڑا بادشاہ بھی تھا، اس نے ایسی حکومت کی کہ اس سے پہلے کے بادشاہ کم ہی اتنی مستحکم حکومت پیش کرسکے تھے، تقریباً نصف صدی تک ہندوستان کی سرزمین پر اس کی اسلامی حکومت قائم رہی، چنانچہ پورے ملک میں امن وسکون کا دور دورہ ہوگیا، ان کے زمانہ میں کمزور بھی توانا ہوگیا، اور مظلوم بھی اٹھ کھڑا ہوا، زندگی اپنے پورے شباب پر آگئی اور معاشرہ کی عزت وسربلندی از سرنو لوٹ آئی، اور مشرق سے مغرب تک شمال سے جنوب تک پورا ملک ایک جنت نشان بن گیا، لوگ مذاہب ومسالک کے اختلاف کے باوجود زندگی کے حقوق سے لطف اندوز ہورہے تھے، اور پورا ملک اسلامی فردوس بن گیا جس میں محبت وشفقت، عدل وانصاف، ایثار وقربانی کی حکمرانی اور اس کی بالادستی نظر آتی تھی۔

ہمارے لئے سعادت کی بات ہوگی کہ ہم تصوف وسلوک میں ان کی سربلندی، اور معرفت وللّٰہیت میں ان کے درجہ کمال کا تعارف کرائیں۔ وہ بادشاہت کے عظیم منصب کے مشاغل کے ساتھ جو تصوف وسلوک کے لئے ایک طرح سے خارج ودخیل بھی ہوتا ہے اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ وہ اس کوچہ سے باآبرو ہوکر نکلیں، اور سلطنت وحکومت کے مشاغل کے باوجود وہ اپنے زہد وپاکدامنی پر برقرار رہے، اور اپنی عصمت وعفت اور زہد وورع کو برقرار رکھتے ہوئے اس کی حفاظت کرتے ہوئے زندگی گزارتے رہے، جب ان کو حکومت وسیادت کا منصب ملا، تو اپنے عدل وانصاف، شجاعت وشہادت، رعایا پر شفقت اور ان کے احوال سے باخبر رہنے والے دنیا کے عظیم شہنشاہوں میں ان کا شمار کیا گیا، انہوں نے لوگوں کی بھلائی، رعایا پروری، عدل وانصاف کے قیام اور ظلم وجور کے خاتمہ اور اس روئے زمین پر فسادیوں اور ظالموں کے دبدبہ کو ختم کرنے کے لئے اپنی زندگی وقف کردی، اور ایسے کارنامے انجام دیئے، جس کی مثال خال خال ہی نظر

آتی ہے۔

چونکہ انہوں نے اس عالم گیتی کے سامنے اپنی مثالی حکومت کا نمونہ پیش کر دیا تھا اور خود اپنی زندگی کو ایک اسلامی بادشاہ کی حیثیت سے نمایاں کر دیا تھا اس لئے انہوں نے حکومت اور علم کی یکجائی، مملکت و معرفت کے سنگم، اور سلطانی و فقیری کے انسجام کی کوشش کی، وہ ان میں سے ہر ایک کے حقوق کی مکمل ادائیگی کرتے تھے حکومت کے بیت المال سے ایک پیسہ نہ لیتے تھے، اور اپنی ذاتی محنت کی کمائی کے سوا کوئی پیسہ خرچ کرنے سے گریز کرتے تھے، وہ اپنے ہاتھ سے قرآن کریم لکھتے تھے تاکہ اس کی قیمت سے ایک زاہد و درویش کی زندگی گزار سکیں اور سد رمق اور کفاف کے بقدر جو کی روٹی کھانے پر اکتفا کرتے تھے۔

کیا ایک لمحہ کا انصاف چالیس سال کی عبادت سے افضل نہیں ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ایسا ہی فرمایا ہے جو عدل و رحمت کی مثال دیکھنا چاہتا ہو اور احساس ذمہ داری سے باخبر ہونا چاہتا ہو، وہ اس درویش صفت بادشاہ کی سیرت پر نظر ڈالے، اور اس عارف باللہ کی زندگی کی طرف دیکھے جس نے اسلامی تاریخ میں عدل و مساوات کی سب سے اعلیٰ مثال قائم کی، اور ملوکیت کی تاریخ کے سامنے ایسا اسوہ پیش کر دیا، جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل جداگانہ اور اپنی قدر و قیمت کے اعتبار سے بالکل ممتاز و منفرد ہے۔

تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہونے کے بعد ان کی امانت و دیانت اور پاکدامنی کے سلسلہ میں ذرا مؤرخ کی شہادت پر بھی نظر ڈالتے ہیں، ''سلک الدرر'' کا مصنف مرادی لکھتا ہے:

''ہمارے زمانہ کا مشہور شہنشاہ ہند اور امیر المومنین، ان کا امام اور ان کا منتظم، مجاہد فی سبیل اللہ، عالم، علامہ، صوفی، عارف باللہ، اللہ تعالیٰ کے دین کو غلبہ عطا کرنے والا بادشاہ جس نے کافروں کو انہیں کی سرزمین میں پسپا کیا، اور ان کی شان و شوکت کو خاک میں ملا دیا، اسلام کی مدد کی اور اس کے علم کو سربلند کیا اور ہندوستان میں

کلمہ خداوندی کو غلبہ عطا کیا اور ہندوستان کے کافروں پر جزیہ نافذ کیا، جب کہ اس سے پہلے کے بادشاہ جزیہ نہیں لیتے تھے، انہوں نے بڑی بڑی فتوحات حاصل کیں، اور مسلسل علاقوں کو فتح کرتے رہے، اور جب بھی وہ کسی شہر کا قصد کرتے تو اس کو فتح کر لیتے، اور اللہ تعالیٰ اس کو دارالاسلام سے بدل دیا کرتے تھے، اس نے اپنے شب و روز رفاہ عام اور روزہ و قیام لیل نیز ریاضت میں بسر کئے، جب کہ یہ چیزیں عام لوگوں کو بھی میسر نہیں ہوتی ہیں، ذلك فضل الله يوتيه من يشاء انہوں نے اپنے لئے ایک لائحہ عمل اور نظام الاوقات بنا رکھا تھا، عبادت کا ایک مخصوص وقت تھا، درس و تدریس کے لئے ایک الگ وقت تھا، فوج کی دیکھ بھال کے لئے الگ وقت تھا، فریادیوں کے لئے ایک متعین وقت تھا، اس طرح وہ ہر کام اپنے وقت پر کرتے ایک کام کو دوسرے وقت کے لئے مؤخر نہیں کرتے تھے، خلاصہ کلام یہ ہے کہ وہ زمانہ کے عظیم ترین لوگوں میں سے ایک تھے اور نظام سلطنت و حکومت میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔"

آپ نے غور کیا کہ اس معاصر مؤرخ نے ان کو کن خوبیوں کے ساتھ یاد کیا ہے، اور ان کو ایک ایسے بادشاہ سے تعبیر کیا ہے، جو ایک زبردست طاقت و قوت اور بے شمار دولت کے مالک ہوتے ہوئے اپنی صفات و خصوصیات میں بے نظیر تھے، اس امانت دار مؤرخ نے ان کے اس فضل کے اعتراف پر بس نہیں کیا بلکہ اس نے سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے اس عظیم بادشاہ کی زندگی کے بعض حقائق کو پیش کرتے ہوئے اپنی گفتگو کو ایک نیا رنگ و آہنگ عطا کیا ہے۔

وہ لکھتا ہے:

"۱۰۶۸ھ میں وہ فرمانروائے سلطنت ہوئے، اللہ تعالیٰ نے اہل ہند کے ساتھ خیر کا ارادہ کیا چنانچہ بادشاہ نے مظالم اور ٹیکسوں پر پابندی عائد کر دی اور ہندوستان کے اُفق سے روشنی کی کرن پھوٹی اور تیموری برج سے بدر کامل نمودار ہوا، اور ان کے اقبال کا ستارہ بلند ہونے لگا۔ انہوں نے ہندستان کے مشہور بادشاہوں کو گرفتار کر لیا اور ان سب کے ملک اورنگ زیب کے زیر فرماں ہوئے، اور عوام الناس نے بادشاہ کی اطاعت کو تسلیم کیا، بادشاہ مستقل جہاد کے لئے برسر پیکار رہتے تھے، اور راہ جہاد میں نکلنے کے

بعد وہ مدتوں اپنے ملک وسلطنت واپس نہ ہوتے تھے اور جب بھی وہ کسی ملک کو فتح کرتے تو دوسرے جہاد میں سرگرم ہوجاتے ان کی فوج لاتعداد بے شمار اور ان کی عظمت وطاقت بے حساب وشاندار تھی، اور ان کی عظمت وقوت کو کسی بھی انداز سے بیان کیا جائے اس کا حق ادا نہیں ہوسکتا، تنہا انہوں نے ہندوستان میں علم وعمل کی جامع ترین سلطنت کو قائم کیا، اہل علم کی وہ بہت تعظیم کرتے تھے، اسی وجہ سے دور دراز ملکوں سے اہل علم یہاں کھنچے چلے آئے۔''

الحاصل ان کے دور میں حسن سیرت، خوف خدا، کثرت عبادت وغیرہ میں ان کی کوئی نظیر نہ تھی، انہوں نے اپنے ملک کے حنفی علماء کو حکم دیا کہ وہ ان کے نام سے فتاویٰ جمع کریں جس میں مکمل مذہب حنفی کے شرعی احکام کا احاطہ ہوسکے، چنانچہ علماء کرام نے کئی جلدوں میں ''فتاویٰ عالمگیری'' کو جمع کیا، اور یہ فتاویٰ حجاز ومصر وشام اور روم میں بہت زیادہ مشہور ہوئے، ان کا بے حساب نفع لوگوں کو پہونچا اور مفتیوں کے لئے یہ کتاب مرجع ثابت ہوئی۔

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اس عظیم شہنشاہ نے آخر کس طرح ضدین کو جمع کرلیا یعنی برصغیر میں حکومت کرنے کے ساتھ ساتھ، نماز ونوافل، ذکر وعبادت اور علم کے ساتھ اشتغال کو کس طرح جاری رکھا؟ کس طرح بادشاہ نے تنگی کی زندگی اور مشکل گزر پر اپنے شب وروز گزارے، وہ جَو کی روٹی پر گزر بسر کرتے تھے اور اپنی ہی محنت کی کمائی کھاتے تھے، اور سونے چاندی کے ڈھیر ان کے اوپر قربان ہوتے تھے، انہوں نے حکومت کے کس طرح اہم معاملات پر بہت جلد کھلا ہوا غلبہ اور عظیم فتح مندی حاصل کرلی تھی، جب کہ وہ شب بیداری اور نوافل واذکار، علم وفقہ، حدیث وادب کے اہتمام کے ذریعہ دنیوی زندگی کے واجبات سے بھی صرف نظر نہیں کرتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ ایمان کی قوت وطاقت تھی جو تجرد اور گوشہ نشینی کی زندگی کو پسند نہیں کرتا، اور نہ ہی ایمان کا تقاضہ ناز ونعمت اور مرفہ الحال زندگی ہوتی ہے، ایمان کا تقاضا

تو یہ ہے کہ انسان بادشاہ ہوتے ہوئے بھی اللہ تعالیٰ کا محتاج بن کر زندگی بسر کرے، اور وہ اپنے کو خدا تعالیٰ کی قدرت کے سامنے ہیچ سمجھے، خواہ وہ کتنا ہی بہادر و طاقتور کیوں نہ ہو، اور زمانہ کے مالدار ترین افراد میں ہوتے ہوئے بھی وہ خود کو ایک عاجز و مسکین سے کمتر نہ شمار کرے، جس نے ایمان کی حلاوت کو چکھ لیا اس کا حال یہ ہوجاتا ہے کہ وہ زندگی کے ہر معاملہ میں خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کی عادت بنالیتا ہے اور دنیا سے بقدر کفاف پر راضی ہوجاتا ہے، اور خلق خدا سے بے نیاز ہوجاتا ہے۔

اورنگ زیب کی زندگی کے بے شمار گوشے ہیں، ان کی زندگی کا ہر گوشہ اس شخصیت کی عظمت اور قدر و منزلت ظاہر کرتا ہے ان کی زندگی ایک نمونہ اور قبلہ نما تھی جوان کو منزل مقصود تک پہونچانے اور سمت کو متعین کرنے میں مددگار ہوتی تھی۔

اسی لئے میں بے جھجک اس عظیم شخصیت کی زندگی کو ہر مکتب فکر کے لوگوں کے سامنے پیش کرنا اپنا حق سمجھتا ہوں خواہ وہ علماء ہوں یا فقہاء، بادشاہ ہوں یا مجاہدین، صوفیاء ہوں یا سالکین، اس لئے ان میں سے ہر ایک کے لئے ان کی زندگی میں درس و عبرت بھی ہے، اور رہنمائی کا سامان بھی۔

اس کے ساتھ ہم کو چاہئے کہ ہم سلطان اورنگ زیب کی زندگی کا گہرائی و گیرائی کے ساتھ مطالعہ کریں، اور اس کی شخصیت میں قوی و پختہ ایمان کو دیکھیں جس نے ان کو تاریخ کی عظیم ہستی بنادیا تھا، اور ان کے کارناموں کو زندہ پائندہ کردیا، اگر ان کا اتنا پختہ ایمان نہ ہوتا تو ان کی یہ سربلندی نہ ہوتی اور نہ ہی اس زمانہ میں ان کا یہ ذکر خیر ہوتا اور نہ ہی ان کے عظیم و عالمگیر کارناموں کے اعتراف میں آج لوگوں کی زبانیں ان کی مدح سرائی کرتیں۔

یہ ایمان و معرفت ہی کی قوت تھی جس کے ذریعہ عالمگیر ایک عالم باعمل ایک عارف باللہ، ایک فقیہ، ادیب اور بادشاہ بن سکے اور اس کی بدولت ہر انسان بلند و بالا مناصب و مدارج طے کرسکتا ہے اور عظیم مراتب پر فائز ہوسکتا ہے۔

حقیت یہ ہے کہ ایمان ومعرفت کے بغیر اگر کسی کو سربلندی حاصل بھی ہوجائے تو نہ تو اس کا اعتبار ہے اور نہ اس میں استقامت وقرار، اس لئے کہ ریت کے تودے پر تعمیر کی جانے والی ہر عمارت ناپائیدار ہے۔

ومن یبتغ غیر الاسلام دینا، فلن یقبل منه وهو فی الآخرة من الخاسرین (سوره آل عمران: ۸۵)

ترجمہ: اور جو کوئی چاہی سوا دین اسلام کے، اور کوئی دین سو اس سے ہرگز قبول نہ ہوگا، اور وہ آخرت میں خراب ہے۔

تفصیل کے لئے ملاحظہ کریں۔

- سلک الدرر: مرادی
- نزھۃ الخواطر: مولانا عبدالحی حسنی
- اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر : ڈاکٹر تاراچند، بی این پانڈے
- اورنگ زیب عالمگیر، ایک تاریخی جائزہ : علامہ شبلی نعمانی

عارف باللہ سید شاہ علم اللہؒ

اس وقت میں آپ کو تاریخ کی تہوں اور اس کی گہرائیوں میں لے جانے کا متمنی نہیں ہوں، بلکہ زیر بحث داستان گیارہویں صدی ہجری کے ایک عارف کبیر کی بے مثال شخصیت کے ذکر پر مشتمل ہے یہ شخصیت عارف باللہ شیخ علم اللہ نقشبندی کے نام سے موسوم ومتعارف ہے جو سلطان اورنگ زیب کے معاصر تھے، سلطان اورنگ زیب خود سرزمین ہند کے ایک مثالی بادشاہ تھے، اوران کے تاریخ میں شاندار کارنامے رہے ہیں، فقہ اسلامی کے میدان میں بھی ان کی نمایاں خدمات ہیں، خاص طور سے فقہی مسائل کی تدوین جس نے وسیع اسلامی لٹریچر میں ایک مقام ومرتبہ حاصل کیا، اور شریعت اسلامی کی تاریخ نے اس کو فتاویٰ ہندیہ کے نام سے جانا، اور یہ کتاب ہر جگہ فقہ وفتاویٰ کے لئے مرجع کی حیثیت ہے، اس بادشاہ کے دور میں ہر فن کی تعلیم وتعلم سے منسلک علماء کی بہت ہی عزت افزائی ہوئی اس نے علم اور دین کی خدمت کرنے والوں کو منتخب کیا، اوران کے لئے مشاہرہ ووظیفہ مقرر کیا، جس وجہ سے علماء درس وتدریس افتاء وتالیف کے لئے یکسو اور فارغ ہوگئے، اس وجہ سے ان کے زمانہ میں علم وعلماء کی قدر وقیمت میں اضافہ ہوا، اور اس بادشاہ کے حسن عنایت واہتمام سے بہت سے دینی مدارس اور علمی دانش گاہیں، قائم ودائم ہوئیں۔

شاہ علم اللہ۔ اس خود دار وغیور بادشاہ کے دور حکمرانی میں پیدا ہونے والے اپنے زمانہ کے ایک ممتاز عالم دین اور ولی کامل تھے، وہ اس خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے جو

حسنی وحسینی شاخ سے متعلق ہے، باپ کی طرف سے ان کا سلسلہ نسب سید حسن مثنی بن حسن بن علی رضی اللہ عنہ پر ختم ہوتا ہے، اور حسن مثنی کی زوجہ سیدہ فاطمہ صغری سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی تھیں، ان کے خاندان کے بعض افراد مدینہ سے عراق منتقل ہو گئے تھے، اور وہاں سے افغانستان ہوتے ہوئے ساتویں صدی ہجری میں ہندوستان آئے اس طرح یہ شریف وحلیم خاندان ہندوستان میں پھیل گیا، اور مختلف شہروں اور گاؤں میں سکونت پذیر ہوا، انہیں میں ایک شہر رائے بریلی ہے جہاں شیخ علم اللہ کے اجداد آئے اور اسی کو انہوں نے اپنا مسکن بنالیا۔

شیخ علم اللہ ان عظیم شخصیات میں سے ایک تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے نسل در نسل لوگوں کی تربیت کے لئے منتخب فرمایا، اور انہیں لوگوں کی ہدایت ورہنمائی کی صلاحیتوں سے مالا مال کیا، اور ان کو حسن اخلاق اور فضائل اعمال کی خوبیوں سے آراستہ وپیراستہ کیا، ان تمام خوبیوں کی وجہ سے ان کو قبولیت عام حاصل ہوئی، شاہ علم اللہ اتباع سنت وعشق رسول کی ایک جیتی جاگتی مثال تھے، اور وہ کامل طور پر اسلام کی ایک زندہ نشانی تھے، انہوں نے للّٰہیت ومعرفت اور علمی ودینی بصیرت میں بہت بلند مرتبہ پایا۔

اسکے ساتھ ہی انہوں نے اپنی اولاد واحفاد کی ایک ایسی نسل تیار کی جو خود علم وعمل کے جامع اور خدا ترس واقع ہوئی، وہ میدان کارزار کے شہسوار بھی ہوئے، اور راتوں کے عبادت گزار بھی، شاہ صاحب کا خاندان اپنی بے پناہ خوبیوں اور لامتناہی امتیازات کی وجہ سے بہت ممتاز ہوا۔

شاہ علم اللہ ۱۰۲۳ھ ہجری میں پیدا ہوئے، وہ بچپن میں ان تمام چیزوں سے بے نیاز تھے۔ جن سے بچے محبت کرتے ہیں، بہت سے بڑے بڑے علماء وصلحاء نے بچپن ہی میں ان کے اندر بلند درجات کا مشاہدہ کرلیا، بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ایک بار اپنے شہر کے بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے، اس وقت ان کی عمر سات سال رہی ہوگی کہ ایک بڑے ولی کا ان کے پاس سے گزر ہوا، جیسے ہی ان کی نظر اس بچے پر پڑی وہ رک گئے، اور اس کی

جانب ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگے، ان کے ساتھیوں نے اس کے بارے میں ان سے دریافت کیا تو فرمایا کہ میں اس لڑکے کے اندر علم و معرفت کے جوہر دیکھ رہا ہوں اور اس کی علامات اس کے چہرے پر روشن ہیں، کتنا نیک بخت ہے یہ لڑکا؟ اور کتنے سعادت مند ہیں اس کے والدین؟ یقیناً اس لڑکے کے ذریعہ بے شمار لوگوں کو اسلام کی ہدایت نصیب ہوگی، اور اس کے خاندان کے ذریعہ ایک جہاں روشن و منور ہوگا، اور وہ اپنے عہد و تاریخ میں منفرد و ممتاز ہوگا۔

عنفوان شباب تک پہونچے ہی تھے کہ ان کے ماموں سید ابو محمد ان کے لئے فکرمند ہو گئے کہ کوئی ایسا کام ان کے ہاتھ آجائے جس سے ان کے معاش کے مسئلہ کا حل نکل سکے، سید ابو محمد کو دربار شاہی سے اس وقت قرب خاص حاصل تھا یہ شاہجہاں کا دور حکومت تھا، چنانچہ انہوں نے شاہ صاحب کو دربار میں لے جانے کی کوشش کی، تاکہ بادشاہ سے ان کے لئے کسی کام کے لئے بات کریں، شاہ علم اللہ کو وہ دربار میں لے گئے اس وقت وہ عملی تربیت کے مرحلہ سے گزر رہے تھے، انہیں یہ بات پسند نہ آئی اور ان کے دل میں انقباض پیدا ہونے لگا، لیکن اپنے ماموں سید ابو محمد کی تعظیم و احترام میں وہ انکار بھی نہ کر سکے لیکن ایک رات ایسا واقعہ پیش آیا جو ان کی نوکری سے علیحدگی اور بس اللہ کے لئے وقف ہو جانے کا سبب بنا۔

شاہجہاں کا معمول تھا کہ اس کے پورے سفر میں چار لوگ اس کے تخت سلطنت کی نگہبانی کرتے تھے، ایک بار بادشاہ ایک جگہ قیام پذیر تھا جب وہ رات میں بیدار ہوا تو اس نے حاضرین کے بارے میں دریافت کیا پتہ چلا کہ کوئی بھی موجود نہیں ہے، شاہ علم اللہ ان کے پاس تھے، انہوں نے جواب دیا تو بادشاہ نے ان کا نام دریافت کیا، اس رات بڑی سردی تھی اور بارش بھی ہو رہی تھی، تھوڑی دیر کے بعد بادشاہ پھر بیدار ہوا، اور پھر دوبارہ اس نے لوگوں کو آواز دی، کسی کو موجود نہ پایا پھر شاہ علم اللہ نے جواب دیا، جوان کے پاس ہی تھے، اسی طرح سوال و جواب میں پوری رات گزر گئی، جب صبح ہوئی تو شاہ علم اللہ سے بادشاہ

نے کہا، کہ رات میں نے تمہارے علاوہ کسی کو نہ پایا، اور بادشاہ ان کی حاضری اور احساس ذمہ داری سے بہت مسرور ہوا چنانچہ اس نے ان کو قیمتی انعامات اور شاہی خلعت سے نوازا، لیکن شاہ علم اللہ اس سے خوش نہ ہوئے، اور بادشاہ کی خدمت میں اس رات کے ضائع ہونے کا افسوس کرنے لگے، اور انہوں نے اپنے دل میں کہا کہ میں نے صرف ایک مخلوق کے لئے اپنی پوری رات گزار دی، کاش میں اس رات ملک الملوک اور خالق کائنات کی خدمت میں بیدار رہتا جو مجھے ایسی نعمتوں سے نواز سکتا ہے، جو کبھی بھی فنا نہ ہوں، اور ایسے انعامات عطا کر سکتا ہے جن کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہو، وہ ایسا بادشاہ ہے جس کو کسی حاجب ومحافظ کی ضرورت نہیں ہے، جب کہ دنیا کے بادشاہ محافظوں اور دربانوں کے محتاج ہوتے ہیں، اس کا دروازہ ہر غنی وفقیر اور ہر چھوٹے بڑے کے لئے کھلا ہوا ہے، وہ لوگوں اور ملکوں کے انجام پر قادر رہے پھر کیوں نہ میں اسی کی طرف پوری توجہ کروں اور کیوں نہ اسی کا ہو کر رہ جاؤں۔

اس خیال نے ان کو بے کل کر دیا یہاں تک کہ صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا، مجبوراً وہ بادشاہ کے دربار سے حسرت وندامت کے احساس کے ساتھ رات کے کسی حصہ میں ننگے پاؤں نکل گئے، اور لوگوں سے کہنے لگے، کہ میں اپنا تمام مال ومتاع تقسیم کرتا ہوں اس لئے جو اس کو لینا چاہے لے جائے، لوگ ان کے مال واسباب پر ٹوٹ پڑے اور جس کے جو ہاتھ لگا وہ لے گیا، ان کے ماموں کو جب اس کی خبر ملی، تو وہ دوڑے دوڑے آئے، اور انہوں نے اپنے بھانجہ شاہ علم اللہ کو راضی کرنے کی کوشش کی لیکن وہ مصر رہے اور فرمایا، کہ ماموں جان، میرے سلسلہ میں آپ کی فکر اور میرے بارے میں آپ کی پریشان حالی مجھ سے پوشیدہ نہیں ہے، لیکن میرے بس میں کیا ہے کیونکہ میرے سینہ میں صرف ایک ہی دل ہے اور وہ ایک وقت میں ایک دوسرے سے مخالف کام کو انجام نہیں دے سکتا اس لئے آپ مجھے میری حالت پر چھوڑ دیجئے، اور دربار میں نوکری کے سلسلہ میں اپنی مساعی کو ترک کر دیجئے، انہوں نے شاہ صاحب کے بھائیوں اور دوستوں کے ذریعہ بھی انہیں راضی

کرنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے ماننے سے انکار کر دیا، اور اپنے فیصلہ کے آگے انہوں نے سپر نہیں ڈالی۔

شاہ علم اللہ حیات انسانی کے راز ہائے سربستہ، خالق ومخلوق کے ربط وتعلق، اور کائنات کے سلسلہ میں غور وتدبر کیا کرتے تھے وہ تزکیہ نفس کے لئے سخت مجاہدے بھی کرتے کبھی وہ لکڑیاں چنتے اور بازار میں لکڑیوں کو فروخت کیا کرتے تھے اور کبھی کبھی میٹھا پانی لوگوں کے گھروں کو لیجاتے اور اس کے عوض معمولی اجرت لے لیتے تھے، اسی دوران وہ کسی بزرگ کی تلاش میں سرگرداں ہوگئے جس کے پاس علم اور اخلاق وتزکیہ کے لئے وہ تربیت حاصل کرتے، یہاں تک کہ ان کی رسائی لاہور میں عارف باللہ سید آدم بنوری رحمۃ اللہ علیہ تک ہوگئی، اتفاق سے اس وقت مزدور خانقاہ کی مرمت اور اس کے ایک منہدم شدہ حصہ کی تعمیر میں مصروف تھے، یہ بھی ان کے ساتھ شریک عمل ہوگئے، اور گارے، مٹی کو لانے لے جانے، میں اپنا وقت صرف کیا، اس کے بعد وہ شیخ آدم بنوری رحمۃ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور سلام کیا، حضرت آدم بنوری نے جواب دیتے ہوئے کہا، محترم میدان عمل میں آیئے اور سرخروئی حاصل کیجئے، اس کے بعد انہیں بہت سی بشارتیں دیں اور رخصت کر دیا۔

کچھ عرصہ کے بعد سید آدم بنوری رحمۃ اللہ علیہ کا گزر دہلی شہر سے ہوا، شاہ علم اللہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے یہ تقریباً ۱۰۴۹ھ کا واقعہ ہے جب وہ زیادہ سے زیادہ چھبیس سال کے تھے، اور یقیناً تصوف کی راہ میں یہ ایک چھوٹی عمر ہوا کرتی ہے، لیکن اس صغرسنی کے باوجود وہ معرفت ربانی کے بلند درجات پر فائز ہوگئے تھے، سید آدم بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو اجازت وخلافت سے بھی سرفراز کیا تھا، جب کہ وہ سید آدم بنوری کے پاس کچھ ہی دن رہے تھے جب وہ رخصت کرنے لگے تو شاہ علم اللہ نے ان سے کہا کہ میرے علاقہ میں بے شمار اولیاء اللہ ہیں ان عظیم علماء وشیوخ کی موجودگی میں میرے کار تربیت کی آخر کیا حیثیت ہوگی، شیخ آدم بنوری نے جواب دیا، اے شیخ علم اللہ، تم ان لوگوں

کے درمیان ایک ایسی روشن شمع کی طرح ہو جو چند چراغوں کے درمیان ہو، یا تمہارا حال تاروں کے مقابلہ میں آفتاب کی طرح ہوگا۔

شاہ علم اللہ کی زندگی کی خصوصیات اور امتیازات اتباع سنت اور عزیمت پر عمل ہے، وہ ان دونوں چوٹیوں کی بلندی پر پہونچ گئے تھے، اور وہ اتباع سنت اور عزیمت کے لئے کسی طرح کا بھی سودا کرنے کے لئے تیار نہ ہوتے تھے، اس کے علاوہ وہ ہر شخص کی ہر لمحہ اور ہر پہلو سے دلداری کرتے تھے، عہد عالمگیری میں اور اس کے بعد ہر زمانے میں علماء ومشائخ کی کثرت کے باوجود سنت کے اہتمام کی کوئی نظیر نہیں ملتی، شیخ کی اس خصوصیت نے کی ان کی زندگی کو تاریخ اسلامی میں روشن ومنور کیا اور اسلامی تاریخ فخر واعزاز کے ساتھ ان کے اس کارنامہ کو بیان کرتی ہے، اور عربی شاعر کے اس شعر کو وہ زبان حال سے گنگناتی نظر آتی ہے۔

اولئك آبائی فجئنی بمثلهم

اذا جمعتنا یا جریر المجامع

شاہ صاحب کا خیال تھا کہ تقرب الی اللہ اور اس کی محبت اور رضا کے حصول کے لئے اتباع سنت کا بہت اہم کردار ہے اور یہ ایسی چیز ہے جو مشکل ریاضت اور مجاہدہ سے حاصل نہیں ہوتی اور نہ کسی تعلیم وتربیت سے۔

ان کی پوری کی پوری زندگی اس بات کی شہادت دیتی تھی کہ اتباع سنت ہر زمانہ اور ہر شے میں اللہ تعالیٰ تک پہونچنے کے لئے تمام عبادتوں اور ریاضتوں سے بڑھ کر ہے، یہی اتباع سنت اور عزیمت پر عمل ہی ہے جو انسان کو سالوں کی مسافت کو مہینوں میں ادا کرنے پر قادر کردیتا ہے، اسی طرح وہ مہینوں کی مسافت چند دنوں میں اور چند دنوں کی مسافت چند لمحوں میں طے کرادیتی ہے، ان کے ایک شاگرد شیخ عبدالحکیم سیالکوٹی کی کتاب شاہ صاحب کی اتباع سنت پر گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''شاہ علم اللہ ایک خدا رسیدہ شخص تھے وہ علم وورع میں کامل ومکمل تھے، ان

کے ظاہر و باطن سے اتباع سنت کے آثار ظاہر ہوتے تھے، ان کی پوری زندگی اور تمام اوقات اعمال سنت اور مستحبات سے لبریز تھے، پوری دنیا میں کیا مشرق کیا مغرب ہر جگہ ان کے تقویٰ اور استقامت کا چرچا تھا، خواہ کوئی بھی شخص ہو اور کیسی بھی حالت ہو وہ عزیمت پر عمل کرتے تھے، جب ان کو ان کی اولاد یا مریدین میں سے کسی کے سلسلہ میں معلوم ہوتا کہ اس نے رخصت پر عمل کیا تو وہ اس سے منع کرتے لیکن اگر ان میں سے کسی کی بدعت کے بارے میں پتہ چلتا تو اس کی بہت زیادہ ڈانٹ ڈپٹ کرتے اور جب تک وہ توبہ واستغفار نہ کر لیتا اس کا چہرہ بھی دیکھنا گوارا نہ کرتے۔''

انہوں نے ایک رسالہ ''قوۃ العمل'' کے نام سے تصنیف کیا جو ایسے حقائق اور دقیق معارف پر مشتمل ہے جس کا ہر شخص ادراک نہیں کر سکتا ہے شاہ صاحب اپنے احوال چھپاتے اور عجز وانکساری کو ظاہر کرتے، ان کو دیکھ کر صحابہ کی یاد تازہ ہو جاتی تھی، جب بھی لوگ ان کو دیکھتے بے اختیار کہہ پڑتے کہ ان کی زندگی بالکل صحابہ کی طرح دکھائی دیتی ہے وہ اخلاق فاضلہ کے ایک سچا نمونہ تھے، شاہ علم اللہ اپنے شب وروز اتباع سنت اور عمل بالعزیمت میں گزارتے تھے، سنت ان کے رگ وپے میں سرایت کر چکی تھی، یہاں تک کہ وہ ان کا ذوق وشوق بن گئی تھی، جس کو وہ کسی بھی لمحہ جدا نہ کر سکتے تھے، اور جس طرح ایک مچھلی پانی کے بغیر نہیں رہ سکتی ہے، شاہ صاحب بھی سنت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔

شاہ صاحب دوسرے عارفوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ عبادت گذار اور ذکر ودعا اور نوافل کے لئے شب بیداری میں ممتاز تھے، اس سلسلہ میں ان کو درجۂ کمال حاصل تھا اور ایسی عجیب وغریب چیزیں پیش آتی تھیں، جن کا اس مادی دور میں گمان بھی مشکل ہے، ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کسی شخص کے مریدین ومتبعین ہوں اور ان سے محبت کرنے والوں اور محبت میں جان دینے والوں کی ایک جماعت ہو لیکن وہ زندگی کے واجبات کی ادائیگی اور خود لوگوں کی خدمت کرنے میں ذرا بھی تساہلی سے کام لے، اسی طرح وہ بچوں کو سلام کرنے گھر کو جھاڑو دینے اور گھر کے کاموں کی انجام دہی کے لئے خادموں کا ساتھ

دینے اور دیگر امور کی انجام دہی میں ذرا بھی تردد نہیں کرتے تھے، یہاں تک کہ جنگلات سے لکڑی چننے، گھڑا بھرنے لکڑیوں کو اپنے گھر لانے اور سر پر رکھ کر اپنے دوستوں کے گھر لیجانے میں بھی ذرہ برابر نہیں جھجکتے تھے، جب کہ ان کے خدمت گزار، اور پیروکار، بار برداری و دیگر ضروریات کو پورا کرنے والے موجود ہوتے تھے یہ ساری چیزیں ہر انسان کے لئے ایک آزمائش ہیں، اور ہر انسان کے لئے یہ کام بہت دشوار ہوتا ہے لیکن شاہ علم اللہ اس میدان کو سر کرنے والے نمایاں شخص تھے، وہ اس امتحان سے بامراد نکلے اور پورے امتیاز اور تفوق سے ان کو کامیابی حاصل ہوئی، میں ان کے بلند مرتبہ اور معرفت خداوندی کے سلسلہ میں ان کے درجۂ کمال کو شمار نہیں کرسکتا، حقیقت یہ ہے کہ ان کے نزدیک ہوا وہوس کا کوئی شائبہ بھی نہیں تھا، اور خواہشات نفسانی اور شہوات انسانی میں سے کوئی چیز بھی ان کے پاس نہ تھی اس لئے کہ انہوں نے نفس اور اس کے متعلقات پر قابو پالیا تھا۔

جو شخص اپنے نفس کو شکست دیدے اور اس پر غالب آجائے تو تمام روحانی امراض اور قلبی بیماریوں سے وہ چھٹکارا پاجاتا ہے، اور ولایت وربانیت کے درجۂ کمال تک پہونچ جاتا ہے، جہاں پہونچنا ایک دشوار مرحلہ ہے اور ہر کس وناکس کا وہاں گذر نہیں، شاید یہی ہر مومن مجاہد مسلمان کی سب سے آخری منزل ہوتی ہے جس کے ذریعہ وہ خدا اور بندے کے درمیان قرب کے راز کو پالیتا ہے اور وہ اس روئے زمین پر انسان کی تخلیق کے اصل مقصد سے واقف ہوجاتا ہے چنانچہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی محبت میں فنا ہوجاتا ہے اور بغیر کسی افراط وتفریط کے اعتدال کی زندگی گزارنے لگتا ہے، اعتدال کا یہی راستہ ہر لمحہ اس کی ہمراہی کرتا ہے اور جب کبھی وہ مقصد سے انحراف اور جادۂ منزل سے بھٹکتا ہے تو یہ اس کی رہنمائی کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو اتباع سنت اور ترک بدعت کے سچے جذبات سے نوازا تھا، سنت کے اختیار کرنے اور اس کے رنگ میں رنگ جانے کے وہ شدت سے حریص تھے اسی طرح بدعت کے لئے وہ سخت غصہ کا اظہار کرتے تھے جب انہیں معلوم ہوتا کہ کوئی

بدعت کا ارتکاب کررہا ہے تو اس کی سخت ڈانٹ ڈپٹ کرتے اور اس کی طرف دیکھنا بھی گوارہ نہ کرتے تھے اور اس سے ملاقات اور اس کے ہدیوں کا قبول کرنا در کنار سلام کا جواب دینا بھی گوارہ نہ کرتے تھے اسی طرح اجتماعی اور انفرادی تقریبات میں اگر کوئی خلاف سنت بات پیش آجاتی تو وہاں سے چلے آتے، وہ "الحب فی الله والبغض فی الله" کے عملی مصداق تھے اس لئے اگر کوئی خلاف شرع کام کرتا تو وہ ناپسندیدگی اور نفرت کا اظہار کرتے اور جب تک وہ توبہ واستغفار کرکے رجوع نہ کرلیتا اس سے کسی قسم کا تعلق روا نہ رکھتے تھے۔

شاہ علم اللہ کا دسترخوان عام تھا اس میں ہر چھوٹا بڑا، مہمان ومیزبان سب برابر تھے وہ اپنے مریدین یا اہل خاندان اور دیگر زائرین اور غرباء دیار کے درمیان کوئی فرق نہ کرتے، عدالت ومساوات کی فضا ان کے دسترخوان پر مکمل طور پر چھائی رہتی، اگر کوئی وفد یا مہمان ان کے پاس آتا تو تین دن تک وہ اس کی خدمت بجالاتے اور اہتمام خاص کرتے اور اس میں اپنے گھر والوں کو بھی شریک کرتے، سخت ضرورت کے علاوہ وہ کبھی کسی خاص کھانے کے پکانے کا حکم نہ دیتے وہ اس سلسلہ میں سنت کی پیروی کرتے تھے اور کھانے کے تمام امور میں سنت کے نفاذ کے خواہشمند رہتے تھے، جب ان کے زمانہ کے بعض اہل علم کو یہ معلوم ہوا تو انہوں نے ان کی دعوت اور میزبانی کی نقل کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ ایسا نہ کرسکے، اور انہیں اس میدان میں شاہ علم اللہ کے افضلیت کا اعتراف کرنا پڑا۔

کبھی کبھی ان پر فاقہ کی نوبت بھی آجاتی تھی، اور یہ سلسلہ کئی کئی دن چلتا رہتا تھا، ایک بار تین دن کے فاقے کے بعد چالیس لوگوں کا کھانا پکایا گیا اچانک ایک وفد ان کے بڑے خلفاء کا آن پہونچا، ان کے ساتھ اسی ۸۰ لوگ تھے، شاہ صاحب نے کھانے کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کا حکم دیا، آدھے کو انہوں نے اہل وعیال کے پاس بھیج دیا اور آدھا حصہ مہمانوں کے سامنے پیش کردیا اس طرح بیس لوگوں کا کھانا تقریباً سو لوگوں کے لئے کافی ہوگیا، جب وہ لوگ کھانے سے فارغ ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ کھانے میں کوئی کمی نہیں واقع ہوئی بلکہ وہ جیسے پہلے تھا ویسے ہی رہا۔

جہاں تک ان کے ورع اور زہد کا تعلق ہے، اس میں ان کو شان امتیازی حاصل تھی اور وہ اس کے منتہا تک پہونچ چکے تھے، اور یہ ہی وہ اصل محرک تھا جس نے ان کو للّٰہیت اور اخلاق وفضائل کے اس درجہ پر فائز کیا، اور اس چیز نے ان کو حقیقی بندگی کے اس مقام پر پہونچادیا جہاں انسان اپنے معبود کی محبت میں فنا ہوجاتا ہے، اور اسے اس کے علاوہ کوئی چیز اچھی نہیں لگتی، اور دنیا کے ساز وسامان اور لذت وعیش میں اسے کوئی مزہ نہیں ملتا وہ صرف اللہ تعالیٰ کے رسول کی اطاعت میں اپنی زندگی بسر کرتا ہے، اس حیثیت سے یقیناً شاہ علم اللہ ایک بہت بڑے صوفی اور عارف باللہ تھے، انہوں نے محبت وطاعت کی چوٹی کو سر کیا اور زہد وتقویٰ کی بلندی پر پہونچ گئے اور اس مرحلہ کو پورا کرنے کے لئے اپنے متبعین، ساتھیوں اور معاصرین کی طرف سے بہت سی آزمائشوں کا سامنا کیا لیکن کہیں بھی ان کے قدم نہیں لڑکھڑائے اور ان رکاوٹوں نے ان کے عقائد واوصاف میں استقامت اور مزید رسوخ ہی پیدا کیا۔

ان کو حضورؐ سے سچا عشق تھا، یہ عشق ان کی رگ رگ میں سرایت کر چکا تھا اس لئے وہ حضورؐ کے سچے عشق اور محبت میں ڈوبے ہوئے تھے، ان کی بہت سی حکایتیں ہیں جن سے ان کے محبت رسولؐ اور عشق حقیقی کے جذبات کا پتہ چلتا ہے، شاہ علم اللہ کے ایک بہت اہم دوست شیخ عبدالرحمان کی بیان کردہ حکایت کو ہم یہاں درج کرتے ہیں جس سے ان کے حضورؐ سے عشق اور محبت کا اشارہ ملتا ہے، وہ بیان کرتے ہیں:

''ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ شاہ علم اللہ اپنے گھر سے نکلے اس وقت ان کے ہاتھ میں ایک رسی اور کلہاڑی تھی انہوں نے مجھ کو جگایا اور کچھ دوسرے لوگوں کو ساتھ لے کر جنگل کی طرف چل دیئے ہم سب نے لکڑی چنی، اور لکڑیوں کے ڈھیروں کو سروں پر رکھا، شاہ علم اللہ نے بھی ایک ڈھیر اپنے سر پر رکھا، ہم لوگوں نے خانقاہ کا رخ کیا جب وہ وہاں پہونچ گئے، ڈھیر اتار کر وضو کیا اور مسجد چلے گئے، وہاں ان کے ایک رشتہ دار جوان کو قرآن سنایا کرتے تھے، وہ قرآن مجید سنانے کے لئے ان کی طرف

بڑھے میں نے غور سے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسجد کے ایک گوشہ میں تشریف فرما ہیں، انہوں نے مجھ کو بلایا اور مجھ سے فرمایا اے عبدالرحمان اس شخص کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ میرا بیٹا علم اللہ اس وقت بہت تھکا ہوا ہے، اس لئے کہ اس نے اپنے سر پر لکڑی کا بوجھ اٹھایا تھا اور وہ کسی دوسرے وقت ان کو قرآن مجید سنا دے۔

جب میری آنکھ کھلی تو میں نے اس خواب کو حقیقت میں بدلتے ہوئے دیکھا، شاہ علم اللہ جنگل گئے انہوں نے اور ان کے ساتھیوں نے لکڑیاں چنیں، اپنے سروں پر گٹھر رکھے ان کو لیکر مسجد آئے، وضو کیا اور مسجد میں داخل ہو گئے، یہاں تک کہ ایک شخص جوان کو قرآن سنایا کرتا تھا جب ان کی طرف بڑھا تو میں نے اسی وقت اس کو قرآن سنانے سے منع کرنا چاہا، شاہ علم اللہ غصہ ہوئے اور فرمایا کہ تم مجھ کو قرآن پڑھنے سے روکتے ہو میں نے کہا کہ ہاں یہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی اتباع کر رہا ہوں، شاہ علم اللہ نے کہا کہ عبدالرحمٰن نے سچ کہا اور انہوں نے اس قرأت کو دوسرے وقت کے لئے مؤخر کر دیا۔''

اتباع سنت اور بدعات ومنکرات کے رد کے سلسلہ میں شاہ علم اللہ کے اس طرح کے بے شمار کارنامے ہیں انہوں نے روحانیت اچھے اخلاق اور خوش نما زندگی کے ذریعہ معاشرہ پر گہرا اثر ڈالا، اور ہر خاص وعام کی اصلاح کی کوشش کی اور ان کے ذریعہ بہت سے لوگوں نے کتاب وسنت کے ذریعہ دین صحیح کو اختیار کیا اور صاف ستھری اور پاکیزہ زندگی کے اعلیٰ نمونے پیش کئے، شاہ علم اللہ کی وفات ۹ رذی الحجہ ۱۰۹۶ھ میں ہوئی، اس وقت وہ ترسٹھ سال سے متجاوز تھے، اسی دن اس وقت کے بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے خواب میں دیکھا کہ آج حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی، اور فرشتے ان کے جنازہ کو آسمان کی طرف لے جا رہے ہیں۔

اس خواب نے بادشاہ کو بے چین کر دیا اس نے علماء سے اس خواب کی تعبیر دریافت کی، تو ان لوگوں نے بتایا کہ شاہ علم اللہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سچی محبت کرنے والوں اور ان کے متبعین میں سے تھے، آج وفات پا گئے، بادشاہ نے اپنے تاریخ نویس کو اس

تاریخ کے نوٹ کرنے کا حکم دیا ہی تھا کہ چند لمحوں کے بعد ان کی وفات کی خبر آ گئی بادشاہ نے اپنا خواب بیان کرنے کے بعد تعبیر بتانے والوں سے پوچھا تو ان لوگوں نے کہا کہ ''ہم نے اپنے معاصرین میں اللہ اور رسول کی سچی محبت اور اتباع سنت میں شاہ علم اللہ کا کوئی ثانی نہیں دیکھا۔''

اللہ تعالیٰ ان کو اپنی وسیع رحمت کے دامن میں ڈھانپ لے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبا است بر جریدہ عالم ، دوام ما

تفصیل کے لئے ملاحظہ کریں۔

- تذکرہ سید شاہ علم اللہؒ
- نزھۃ الخواطر
- مہر جہاں تاب (قلمی)
- حیات عبدالحی
- سیرت سید احمد شہید

شاہ ولی اللہ دھلویؒ

(۱۱۱۴ھ-۱۱۷۶ھ)

سترھویں صدی عیسوی کے آغاز میں ہندوستان کی اسلامی تاریخ نے ایک ایسے عظیم قائد اور چمنستان علم ودین کے گل سرسبد کو جنم دیا جس نے اس سرزمین پر صالح اسلامی افکار اور بیش قیمت علوم کی اشاعت میں کارہائے نمایاں انجام دیئے، اور پُر پیچ وادیوں کے درمیان ایک سیدھا راستہ نکالا، انہوں نے موجودہ حالات کے مقابلے کے لئے لوگوں کے اندر تڑپ اور بے چینی پیدا کی، اور اس امت کی بقا اور اس کی تعمیر وترقی کے لئے بیش بہا منصوبے اور لائحہ عمل پیش کئے، ان کی یہ کوشش اسلامی معاشرہ کی تشکیل نو کے لئے ایک نئے عہد کا آغاز تھی اور اسلامی زندگی کا ایک بہترین نمونہ پیش کرنے والی زندگی سے لوگوں کو متعارف کرانے کے لئے یہ ایک نئی پہل تھی، یہ شخصیت شیخ الاسلام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تھی۔

شیخ الاسلام قطب الدین ولی اللہ بن عبدالرحیم الدہلوی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کی وفات کے اسی ۸۰ سال کے بعد (۱۱۱۴ھ میں) پیدا ہوئے، ان کا یہ دور ہندستانی مسلمانوں کی تاریخ کا ایک تاریک ترین دور تھا، اس دور کے بادشاہ وسلاطین اپنی عیش کوشیوں میں بدمست تھے، اور وہ رعایا اور ملک کے مفاد پر اپنے راحت وآرام کو ترجیح دینے والے تھے۔

اس دور میں تقلیدی علوم عصبیت اور بے راہ روی کا انسانی ذہنوں پر دور دورہ

تھا، پورا کا پورا ملک ذہنی بے راہ روی اور اخلاقی گراوٹ کا شکار تھا، اور جان و مال کی بے پناہ محبت نے ان کو مختلف روحانی امراض میں مبتلا کر دیا تھا، اور وہ مال و جان کی ہوس کی وجہ سے لوٹ مار ظلم و جور، اور قتل و غارت میں گرفتار تھے۔

ایسے تاریک دور میں شاہ ولی اللہ جیسی عبقری شخصیت کا ظہور تاریکیوں میں روشنی کی علامت ثابت ہوا، انہوں نے اس تاریکی کو دور کیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں ان برائیوں کا خاتمہ کر دیا، انہوں نے امت اسلامیہ کے گرد آلود ماحول کو خوشنمائی عطا کی، اور ان کے دستور حیات کو صحیح رخ دیا، جب کہ اس وقت امت مسلمہ کا اپنے اصل مسائل سے کوئی واسطہ تک نہ تھا، مسلمان دین و دنیا دونوں سے غافل، فضول امور میں اپنا وقت برباد کر رہے تھے، اپنے اصل مقصد کو انہوں نے فراموش کر دیا تھا، اور اپنے واجبات سے انحراف کر چکے تھے، اور اپنے مقام و مرتبہ سے لاعلم تھے، ان کو نہ حقوق کا پتہ تھا اور نہ ہی جادۂ منزل کا علم۔

اس وقت شیخ الاسلام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی حیات جاوید کا تفصیلی تذکرہ میرا مقصود نہیں ہے، اس کا دوسرا موقع ہے، لیکن شاہ صاحب کی زندگی پر چند سطور کے لکھنے کا محرک یہ ہے کہ ہم ان کی زندگی کے اس پہلو کا جائزہ لیں جو خود ہمارے لئے اور ہمارے قارئین کے لئے اہمیت کا حامل ہے۔ یہ پہلو ان کی روحانیت اور معرفت کا ہے جس کے ذریعے شاہ صاحب نے عظمت و سربلندی، بصیرت، وسعتِ نظر، اور علوم و معرفت میں بالادستی اور اسلامی موضوعات پر نظریہ سازی کا ملکہ حاصل کیا۔ جس کے ذریعہ اسلامی لٹریچر کا ستارہ اقبال ہمیشہ بلند رہے گا اور اس ملک میں طبقہ علم و علماء کو ہمیشہ عزت و سربلندی حاصل رہے گی۔

شاہ ولی اللہ کو عوام نے اس حیثیت سے نہ جانا کہ وہ ایک صوفی کی طرح خانقاہ نشین اور خلوت گزین ہو گئے ہوں، اور دنیا سے کنارہ کش ہو کر انہوں نے خود کو ایک شعبہ کے لئے خاص کر لیا ہو جیسا کہ بعض صوفی، زاہد اور مجرد زندگی گزارنے والے لوگ کرتے ہیں تاہم وہ بہت بڑے عارفین میں سے تھے، اور انہوں نے اپنے علم کی طاقت سے معرفت

کے سمندر میں غوطہ زنی کی صلاحیت پیدا کی، اور معرفت کے اس سمندر سے قیمتی موتی چنے، انہوں نے لوگوں کو ایسے ایسے حقائق اور راز ہائے دروں بتائے جس سے وہ اب تک ناواقف تھے، اور یہ ایسے حقائق تھے کہ جن کو سن کر عقل حیران و ششدر رہ جاتی ہے، شاہ صاحب نے اسلام کے روحانی پہلو کی وضاحت کی، اور اس کی تشریح و توضیح میں اپنے علم کے دریا بہا دیئے اور ایسے ایسے حقائق، علوم و اسرار بیان کئے کہ جن کا ذہن میں خیال بھی نہیں آتا، انہوں نے سلوک و تصوف کے علوم پر مشتمل بہت ہی قیمتی مواد اور دقیق مضامین پر مشتمل ایک بڑا کتب خانہ تیار کر دیا، جو اپنی قدامت کے باوجود ہمیشہ جدید و جاوداں رہے گا، اور عام انسانیت کو زندگی، روحانیت اور قوت و علم سے سیراب کرتا رہے گا۔

علامہ عبدالحی حسنیؒ اپنی کتاب نزہۃ الخواطر میں تحریر کرتے ہیں:

''انہیں علوم میں جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا کئے تھے، تصوف کے اصول اور حقائق کا علم ہے، انہوں نے معرفت کے سرچشموں سے اہل تصوف کی پیاس بجھائی، اس لئے کہ وہ طرق ثلاثہ یعنی فکر، ذوق اور استطاعت سے بہرہ ور تھے، اس لئے وہ منقولات و معقولات میں سے کسی کی تصدیق واقفیت کے بغیر نہیں کرتے تھے۔''

شیخ غلام علی علوی دہلوی نے ''مقامات'' میں بیان کیا:

''کہ ان کے شیخ مرزا جان علوی دہلوی بیان کیا کرتے تھے کہ شاہ ولی اللہ نے ایک نیا راستہ واضح کیا اور علوم کی پر پیچ وادیوں اور علوم و معارف کے اسرار کی تحقیق میں ان کا ایک خاص اسلوب تھا۔''

وہ ایک ربانی عالم تھے، علم ظاہر و باطن پر عبور رکھنے والے صوفیاء میں بھی ان جیسا مل پانا مشکل تھا، وہ ان چند ہستیوں میں سے ایک شمار کئے جاتے تھے، جنہوں نے جدید علوم پر بحث و تحقیق کی۔

دلوں کی اصلاح اور تزکیہ نفس کے لئے، ہمیشہ خانقاہوں کی ضرورت نہیں ہوا کرتی ہے، اور ایسا بھی ضروری نہیں ہوتا ہے کہ کون شخص ظاہر و باطن میں زہد اور دنیا سے مکمل

کنارہ کشی اختیار کرے بلکہ یہ مسلسل محنت ومساعی اور ایسی باطنی کوششوں سے روبہ عمل ہوتا ہے جس سے لوگ کم واقف ہو پاتے ہیں۔

بعض مرتبہ تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک عارف برائیوں کے ازالہ اور فساد وبگاڑ کے خاتمہ کے لئے کوشاں رہتا ہے وہ خرافات کے سد باب میں منہمک ہوتا ہے، لیکن لوگ نہیں سمجھ پاتے اور اگر وہ محسوس بھی کرتے ہیں تو وہ اس کی حقیقت کو نہیں سمجھ پاتے اس کو اس قسم کے علاوہ شمار کرتے ہیں جب کہ درحقیقت وہ فساد کی بیخ کنی اور مہلک امراض کے مداوا کے لئے تڑپ رہا ہوتا ہے۔

شاہ ولی اللہ بھی کبھی خانقاہ میں گوشہ نشین نہیں ہوئے، لیکن انہوں نے اصلاح وارشاد کے میدان میں ایسے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے جو عارفین سے بھی نہ ہوسکے، اور اللہ تعالیٰ نے ان سے اصلاح وتزکیہ کی ایسی خدمات لیں، جن کی توفیق چند ہی لوگوں کو ہوسکی۔

انہوں نے اس موضوع پر بہت سی کتابیں تصنیف کیں، ساری کتابیں اپنے اندر دقیق علوم اور معانی ومفاہیم کے خزانے لئے ہوئے ہیں، ان سے عقل کو روشنی ملتی ہے، اور وجدان وجذبات کو جلا ملتی ہے، لیکن اگر ہم اس وقت ان کی ایک ہی کتاب کو موضوع بحث بنائیں اور اس کے علم ومعرفت کے خزانوں کا جائزہ لینا شروع کریں تو ہمارے لئے یہ کام بہت مشکل ہوجائے گا، چہ جائیکہ اس موضوع پر ان کی بے شمار کتابوں پر بحث کی جائے۔

شاہ صاحب محض ایک دینی قائد ہی نہیں تھے، جو لوگوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنا ہے اور دلوں میں ایمان ومعرفت اور محبت وعشق کی چنگاری روشن کرنا ہے بلکہ وہ علم ومعرفت اور دین کی قیادت کرنے والے ایک فرد تھے، اور یہ تمام خوبیاں بیک وقت ان کے اندر موجود تھیں۔

انہوں نے دین کی روح کے خلاف ہر نظر آنے والی چیز پر تنقید کی، اور دین کی کرامت کو مجروح کرنے والی ہر چیز پر کھلی اور سخت مذمت کی، خواہ یہ عمل علماء کی جانب سے ہو یا عوام الناس کی طرف سے، ان کی دینی غیرت وحمیت نے ان کو اس حد تک مجبور

کر دیا کہ انہوں نے اپنے زمانے کے علماء وصوفیا کو للکارا اور ان سے ان چیزوں کی درستگی کا مطالبہ کیا، جو تزکیہ نفس کے راستہ سے ان کے یہاں بے جا داخل ہوگئی تھیں، انہوں نے ان کے سامنے تصوف حقیقی اور تصوف مجازی کے فرق کو واضح کیا، اور ان تمام مضامین پر مشتمل قیمتی کتابیں تصنیف کیں، تاکہ احسان وسلوک کے مفاہیم نہ بدل جائیں، اور لوگ تصوف حقیقی کے اصل چہرہ کو بگاڑ کر اور ان کی غلط تصویر کشی کر کے اس کی جگہ کہیں ایسے تصوف کو نہ داخل کر دیں، جس کا دین سے دور کا تعلق نہ ہو۔

جس تصوف کے شاہ صاحب داعی تھے اس سے پورے طور پر احسان مراد تھا، وہ مخلوق کی خالق سے تعلق کی تشریح کرتے تھے، کہ انسان اللہ تعالیٰ سے تعلق وتقرب اخلاص عمل کے ذریعہ اس طرح حاصل کرے، گویا کہ ہر آن خدا کو دیکھ رہا ہو، اور اگر مان لیا جائے کہ وہ خدا کو نہیں دیکھ رہا ہے، تو وہ ایسا سمجھے کہ خدا تعالیٰ اس کو دیکھ رہا ہے، اور ہر لمحہ اس کے کاموں کی نگرانی کر رہا ہے۔

تصوف کے سلسلہ میں ان کا مسلک واضح ہے، نہ اس میں کوئی پیچیدگی ہے نہ الجھاؤ، وہ اپنی کتاب "التفهيمات الالٰهية" میں تصوف کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

> "ہم میں سے کوئی ایسا نہیں جو کتاب اللہ پر غور وتدبر نہ کرتا ہو، حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو سمجھتا نہ ہو اور کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس نے علماء کی صحبت کو ترک کر دیا ہو، یعنی صوفیاء کی صحبت سے، جن کا کتاب وسنت سے گہرا ربط ہوتا ہے اس طرح فقہ پر بھی ان کو عبور حاصل ہوتا ہے، اور جو جاہل صوفیاء ہیں اور جو لوگ تصوف کا انکار کرتے ہیں وہ راہزن ہیں اور وہ دین پر ڈاکہ ڈالتے ہیں، خدا ہم سب کو ان سے محفوظ رکھے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہم لوگوں کو اپنے فرمانبرداروں میں سے بنائے اور اس کی خوشنودی کا طلبگار بنائے اور ہم اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے، صرف اس کے لئے جیتے رہیں، اور اس کے لئے جان دیں۔"

ان تمام امور کے علاوہ شاہ صاحب علوم دینیہ کی اشاعت اور اپنے افکار

وخیالات کی ترویج کے لئے مجاہدہ وجانفشانی کرتے رہے، اور انہوں نے اس کام کو تالیف وتصنیف وغیرہ کے ذریعہ انجام دیا، یہاں تک کہ ان کی اس جانفشانی کا فائدہ وثمرہ ہندوستان ودیگر اسلامی ممالک تک پہونچا، اور بلاد عرب کے علماء نے اس سے فیض حاصل کیا، اور عرب علماء میں بھی ان کی تصنیفات کو قبول تام حاصل ہوا، اور انہوں نے اپنے عقائد، اخلاق اور اسلامی فلسفے کے لئے شاہ صاحب کی کتابوں کو مرجع اور ماخذ کے طور پر استعمال کیا۔

شیخ الاسلام شاہ ولی اللہ نے علوم دینیہ کے میدان اور اسلامی عقیدہ کی تشریح کے لئے بڑی سرفروشی کی، انہوں نے اسلامی عقیدہ کے خزانوں کو مختلف شکلوں میں جمع کر دیا تاکہ علماء اور بڑے بڑے مصنف اس سے فائدہ اٹھائیں، انہوں نے تن تنہا ایسے ایسے کارنامے انجام دیئے جن کو بڑی بڑی اکیڈمیاں انجام دینے سے قاصر ہیں، جب کہ عجیب بات ہے کہ نہ انہوں نے کسی بڑے دینی ادارہ میں تعلیم حاصل کی، نہ علم وثقافت کے مراکز اور علم وادب کے گہواروں کی سیر کی، اپنے شہر میں ہی اپنے زمانہ کے علماء سے، انہوں نے تعلیم حاصل کی، لیکن اس کے باوجود ان کے لئے اتنے عظیم کارنامے انجام دینا کیسے ممکن تھا، اور کس طرح انہوں نے اس عظیم علمی مرتبہ کو حاصل کرلیا، "ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء والله ذو الفضل العظيم" بس فضل خداوندی کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے۔

امام ہمام، حکیم الاسلام، فلسفی وعالم شاہ ولی اللہ دہلوی نے ۱۱۷۶ھ میں اس سرائے فانی سے کوچ کیا، انہوں نے ہندوستان میں دین وعلم کی تجدید کا کام انجام دیا، اور ان کے قلم کی طاقت اور افکار وآراء کی ندرت سے پورا عالم فیضیاب ہوا، اور انہوں نے علوم وفنون سے بھرا ہوا انتہائی قیمتی علمی خزانہ عالم اسلام کے لئے چھوڑا جو مثبت اسلامی افکار ونظریات کے مفاہیم سے لالہ زار ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی سالکین وعارفین میں ایک ممتاز ومنفرد عارف باللہ تھے، ان کا علم اللہ سے ان کے تعلق اور معرفت کا ذریعہ بنا، وہ عالم سے کہیں بڑھ کر ایک عارف تھے،

اور اسلام کی سرمایہ افتخار شخصیات میں سے ایک عظیم شخصیت کے مالک تھے، ان کی جیسی انفرادی خصوصیات اور ممتاز صلاحیتوں کا مالک تاریخ نے کسی دوسری شخصیت کو پیش نہیں کیا۔

سلام الله ورحمة علی روحه الطاهره

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے

تفصیل کے لئے ملاحظہ کریں۔

- نزھۃ الخواطر
- تاریخ دعوت وعزیمت۔ جلد پنجم

شاہ عبدالعزیز دہلویؒ

(۱۱۵۹ھ-۱۲۳۹ھ)

شاہ عبدالعزیز صاحب کی شخصیت علم وایمان کی جامع تھی، انہوں نے فضل وکمال کے میدان میں سب پر فوقیت حاصل کر لی تھی، اور اپنی قدرت فہم اور دین میں گہرے تفقہ کی وجہ سے کم عمری میں فضل وکمال کی سند حاصل کر لی تھی، اور ابھی پندرہ سال کے بھی نہ تھے کہ مسند درس وافادہ بچھادی اور درس وافادہ کا سلسلہ شروع کر دیا، انہوں نے اپنی زندگی میں بہت اہم کارنامے اور بیش قیمت خدمات انجام دیں، جن کا سرانجام دینا بڑے بڑے علماء وعارفین کے لئے بھی آسان نہیں ہوتا۔

شاہ عبدالعزیز دہلویؒ شیخ الاسلام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے صاحبزادے اور اپنے دور کے علماء کے سردار اور سردار زادے تھے، بعض علماء نے ان کو ''سراج الہند'' اور بعض نے ''حجۃ اللہ'' کا لقب دیا ہے، وہ رمضان المبارک ۱۱۵۹ھ میں پیدا ہوئے اور اپنے والد اور دیگر اساتذہ فن سے انہوں نے دینی علوم کی تحصیل کی، اور حفظ کیا، اور وہ اپنے زمانے کی اہم شخصیات اور کمیاب لوگوں کی فہرست میں شامل ہو گئے۔

انہوں نے علم ودین میں بلند مرتبہ حاصل کیا اور ایسے کارہائے نمایاں انجام دیئے، جن کی توفیق تاریخ اسلامی میں معدودے چند علماء کو ہی نصیب ہوئی، وہ علم وادب، دین ومعرفت، سلوک وطریقت، تصنیف وتالیف اور درس وافادہ کے متعدد پہلوؤں پر کامل

دسترس رکھتے تھے، اور بیک وقت ان تمام صفات کے جامع تھے، چنانچہ ان کے ان کمالات سے لوگوں نے فائدہ اٹھایا، اور انہوں نے علماء اور عوام اور مسلمانوں کے زمرہ میں خیر کثیر کا اضافہ کیا تاریخ نے اس کو محفوظ تو کیا لیکن اس کا اکثر حصہ ضائع بھی ہو گیا۔

تاریخ کی شہادت ہے جو لوگوں کے احوال وحالات کا ایک واحد ذریعہ ہے ایک نہایت امانتدار مؤرخ علامہ عبدالحی حسنی مصنف نزھۃ الخواطر کی شہادت ہے، وہ رقم طراز ہیں:

> ''شاہ عبدالعزیز اپنے فضل وکمال، علم وذہانت، فہم وفراست اور زود حفظ کی وجہ سے دنیا کے ممتاز لوگوں میں سے ایک تھے، پندرہ سال کی عمر میں ہی وہ درس وافادہ سے منسلک ہو گئے، اور درس وتدریس کی وجہ سے ہندوستان میں یکہ ویگانہ شخصیت بن گئے، بڑے بڑے فضلاء نے ان سے علوم وفنون کی تکمیل کی، اور ملک کے اکثر حصوں سے طلبہ ان کے پاس آتے اور ایک تشنہ کام کی طرح اس جام علم ومعرفت پر ٹوٹ پڑتے۔''

اسی کے ساتھ ان کی زندگی کا افسوس ناک پہلو ان کے وہ دردناک امراض تھے جو پچیس سال کی عمر میں ان کو لاحق ہو گئے تھے، انہیں جذام، برص، اور نظر کی کمزوری کی شکایتیں لاحق ہو گئیں یہ امراض اتنے زیادہ تھے کہ چودہ قسم کے امراض ان کے اندر شمار کئے گئے۔

لیکن ان دردناک امراض کے باوجود انہوں نے اپنی مشغولیات اور سرگرمیوں سے سمجھوتہ نہیں کیا، اور واجبات وفرائض کی ادائیگی میں ان امراض کو خلل انداز نہ ہونے دیا، اور ان تمام امراض کے ساتھ ان ذمہ داریوں کو بھی نبھاتے رہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے ناتواں کاندھوں پر ڈالی تھیں، وہ اللہ کے فیصلے پر راضی رہے اور دین اسلام کے غلبہ کے لئے جدوجہد کرتے رہے انہوں نے اپنی دعوت وعلوم کو عام کیا، اور اسلام اور اس کے پیغام کو عام کرنے کے لئے وہ جان وتن سے مصروف رہے۔

اپنے آلام ومصائب کے آگے انہوں نے کبھی سپر نہیں ڈالی، اور اپنے علم وافادہ کے میدان میں وہ ہمیشہ سرگرم سفر رہے، اپنے جہد عمل کے ذریعہ وہ لوگوں کو دین کی باتیں سمجھاتے اور احسان وتصوف کے مفہوم سے آگاہ کرتے، اور کتاب وسنت کے حقائق کھولتے، چنانچہ دور دراز سے آنے والوں کی ایک بھیڑ ان کے پاس اکٹھا ہوتی تاکہ ان کے درس حدیث وقرآن سے فیضیاب ہو، اور وہ اسلامی دستور حیات، اخلاق نبوی اور خدائی احکام کے حقائق سے باخبر ہو سکے۔

ان کے امراض نے ان کی آخری عمر میں انہیں معذور کر دیا، اور ایک مجلس میں دیر تک بیٹھنا ان کے لئے مشکل ہونے لگا، لیکن اس شدت مرض اور عذر کے سامنے انہوں نے اپنا سر خم نہیں کیا بلکہ استفادہ کے لئے انہوں نے دوسرا راستہ اپنایا، لوگ ان کے ساتھ چلتے رہتے اور وہ درس وفتاویٰ کا کام جاری رکھتے تھے، وہ لوگوں کو خیر وصلاح کے راستوں سے روشناس کراتے اور دنیا وآخرت میں ذریعہ نجات اعمال کی طرف ان کی مکمل رہ نمائی فرماتے تھے۔

یہ ان کا شب وروز کا مشغلہ تھا علمی مباحث میں گفتگو، فتویٰ نویسی، اور درس وافادہ سے وہ تھکتے اور اکتاتے نہ تھے، بلکہ اس کی سرگرمی میں انہیں قلبی لذت اور دلی تقویت حاصل ہوتی تھی، اس لئے کہ جو بھی ایمان کی حلاوت کو چکھ لیتا ہے وہ بھی اس حلاوت ولذت کو دوسرے کے دلوں تک پہونچانے کی سعی کرتا ہے، تاکہ وہ لوگ بھی اس حلاوت ولذت سے تشنہ کام ہوں، اور اس شعور ووجدان کو اپنے اندر جاگزیں کریں، ہندوستان کے ایک بڑے مؤرخ لکھتے ہیں:

"لیکن ان تمام امراض کے باوجود خود درس دیا کرتے تھے اور اس کے ساتھ تصنیف وتالیف، فتویٰ نویسی، وعظ وپند کا سلسلہ بھی جاری وساری رکھتے تھے ہر منگل کو قرآن مجید کے حقائق پر مشتمل ان کے مواعظ بھی ہوتے تھے۔

آخری عمر میں جب اٹھنا بیٹھنا بالکل مشکل ہو گیا تو وہ اپنے دونوں قدیم

وجدید مدرسوں کے درمیان چلتے رہتے تھے، اور وہاں اس وقت بہت سے لوگ ان سے فائدہ اٹھاتے تھے، اسی حالت میں درس دیتے تھے، افتاء نویسی کرتے تھے، اور لوگوں کو حق کی جانب رہنمائی کرتے تھے، اسی طرح عصر ومغرب کے درمیان چہل قدمی کرتے ہوئے وہ مدرسہ اور جامع مسجد کے درمیان والی سڑک تک جاتے تھے، وہاں بھی دائیں بائیں لوگ ٹوٹے پڑتے تھے، لوگ راستہ میں ان کے آنے کا انتظار کرتے رہتے تھے اور اپنے مسائل ومشکلات کو حل کرنے میں ان سے مدد لیتے تھے۔''

ان کے علم وادب کے سرچشمہ اور فضل وکمال کے خزینہ پر ہر چہار جانب سے لوگوں کا ہجوم ہوتا تھا، ادباء وشعراء ان کے پاس ان کے ادبی موتیوں وشہ پاروں کو چننے کے لئے آتے، تو علماء ان کے معانی ومفاہیم سے استفادہ کے لئے ان کی طرف رخ کرتے، اصحاب معرفت وسلوک ان سے معرفت کی روشنی اور نور باطن کے حسن وجمال کی جلوہ آرائی اور اپنے دلوں کو منور کرنے کے لئے ان کی طرف رخت سفر باندھتے اور وہ ان کے اندر ایمان خالص اور یقین صادق کے بیج بو دیتے، اسی طرح بیمار اور ضرورت مند لوگ اپنے دنیاوی مسائل اور فقر وحاجت برآری کے لئے ان کے یہاں کا قصد کرتے، شاہ صاحب ان کی دلجوئی کرتے اور ان کی ضرورت پوری کرتے، ان کے پاس سے کوئی بھی ضرورت مند دل شکستہ اور مضطرب واپس نہ ہوتا، وہ ہر ایک کو اپنے علم وفضل، مال ودولت، احسان واخلاق اور سخاوت وفیاضی میں سے ضرور کچھ نہ کچھ عطا کر دیتے تھے۔

ایک مؤرخ ان کے اس وصف کو کس خوبی سے بیان کرتا ہے۔

''عوام ان کے پاس ان کے علم وادب کے سرچشموں سے سیرابی کے لئے قصد کرتے، ادباء ان کی ادب نوازی کی وجہ سے ان کے پاس آتے اور اپنے اشعار پیش کرتے، ضرورت مند ان کے پاس اپنی غرض سے آتے کہ وہ ارباب حکومت کے پاس ان کی سفارش کر دیں، وہ حسب امکان ان کے ساتھ غمخواری وہمدردی کرتے، ان کی ہمدردی ودلجوئی کی یہ صفت متفق علیہ ہے، بیمار ان کے علاج ومعالجہ سے فائدہ کے لئے ان کے پاس آتے تھے، اور اہل جذب وسلوک ان کے انوار کی کرنوں سے اپنے

دلوں کو منور کرنے کے غرض سے ان کے پاس آتے اور اہل علم وصلاح اور غریب الدیار لوگ ان کے پاس ٹھہرتے، وہ انہیں آرام کے ساتھ رکھتے، ان کی حاجت برآری اور مقصد کو پورا کرنے کی کوشش کرتے، اور اگر ان کی مجلس میں کوئی گم کردہ راہ یا کوئی ایسا شخص جس کو دینی مسائل میں کوئی اشکال ہوتا، شریک ہوتا تو اس کے سامنے اپنی جادو بیانی سے اس کی ایسی تشریح کرتے کہ دوسروں کے لئے ایسا ممکن نہیں ہوتا، اور وہ مطمئن اور راضی ہو کر ان کے پاس سے واپس ہوتا۔''

ایسی عظیم شخصیت برملا اس کی مستحق ہے کہ وہ ایمان وعمل اور علم ومعرفت کا سب سے اونچا مقام حاصل کرے، اور اس روئے زمین پر جو بھی دین ودنیا کی فلاح اور زندگی کی سعادت کا متلاشی اور اطمینان خاطر کا طلبگار ہے، شاہ صاحب کی پوری زندگی اس کے لئے اسوہ کا کام کرتی ہے۔

علم وفتویٰ میں ان کو ید طولیٰ حاصل تھا، خاص طور سے علم حدیث وقرآن پر ان کو بڑا عبور تھا، انہوں نے ان دونوں کے حقائق پر غور وفکر اور تدبر کیا اور اس کی تہوں تک پہونچ گئے اور وہاں سے ایسے بیش قیمت موتی چن کر لائے، جس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی، انہوں نے قرآن مجید کی ایک تفسیر بھی لکھی جس کی صرف دو جلدیں ہی باقی بچیں، بقیہ جلدیں بغاوت ہند میں ضائع ہو گئیں۔

شیخ محسن بن یحییٰ ترہٹی اپنی کتاب ''الیانع الجنی'' میں رقم طراز ہیں:

''وہ شہرت وکمال کی اتنی بلندی تک پہونچ گئے تھے کہ ہندوستان کے لوگ ان کی جانب نسبت کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے، اور صرف یہی نہیں، بلکہ شاہ صاحب کے اصحاب سے بھی تعلق کو وہ اپنے لئے باعث افتخار سمجھتے تھے'' وہ یہ بھی لکھتے ہیں: ''ان کے ان اوصاف وکمال اور کارناموں میں ان کی وہ فراست بھی شامل ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کو خواب کی تعبیر کے سلسلہ میں عطا کی تھی، وہ کسی خواب کی تعبیر جس طرح بتاتے تھے خدا کا کرنا ایسا ہوتا تھا کہ بالکل ویسا ہی پیش آتا تھا، گویا اسکو انہوں نے دیکھ لیا ہو، یہ چیز صرف چند پاکیزہ اہل دل ہی کو حاصل ہوتی ہے، اور جن کا آئینۂ دل گھٹیا

کاموں اور گناہ ومعصیت کے خیال سے دور رہتا ہے، اور اس طرح کی شاہ صاحب کی بے شمار خوبیاں اور فضائل ہیں۔"

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو مختلف قسم کے فضائل وکمالات عطا کئے تھے، جن کی وجہ سے وہ اپنے معاصرین میں فائق وممتاز تھے، اور اگر یہ شعر کہنے والا شاعر ان کو دیکھتا تو اسے ان کی ذات میں اپنے شعر کی تصدیق مل جاتی۔

ولم أر امثال الرجال تفاوتا

لدى المجد حتى عد الف بواحد

(مقام ومرتبہ میں انسانوں کے درمیان اس قدر فرق ہوتا ہے کہ بعض اوقات ایک انسان ہزار انسانوں کی خوبیاں اور فضائل اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے)

تو اگر چہ شاعر نے اپنے حساب سے اس شعر میں مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے لیکن یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ وہ شاہ صاحب کی مدح وتوصیف سے قاصر رہا جب اس طرح کے شاعر سے ان کے فخر وکمالات کو بیان کرنا مشکل ہے تو مجھ جیسا شخص کس طرح انہیں بیان کرسکتا ہے، ان کے کمالات بے شمار اور ان کے فضائل بے پناہ۔

شاہ عبدالعزیز صاحب نے خدا تعالیٰ کی عطا کردہ اپنی تمام صلاحیتوں اور توانائیوں کو فاسد خیالات کی اصلاح اور گمراہ عقلوں کے سدھار اور دلوں کو اللہ تعالیٰ سے قریب کرنے میں صرف کیا۔

ان کی ان مساعی نے اپنا اچھا اثر ظاہر کیا چنانچہ ہندوستان میں علماء ربانی کی ایک پوری جماعت تیار ہوئی، جن کے علم وفضل اور کمال ومعرفت کی عظمت کا سہرا شاہ عبدالعزیز صاحب کے سر جاتا ہے، شیخ نے محض علمی وادبی غذا کی فراہمی کا کام نہیں کیا، بلکہ اپنے پیچھے ایک ایسی جماعت چھوڑی جس نے ان کے علم کے سرچشمہ سے سیرابی حاصل کی، اور ان کے روحانی خزانہ سے استفادہ کیا۔

شاہ عبدالعزیز اسی (۸۰) سال اس جہاں گیتی میں گزار کر ۱۲۳۹ھ کو اس

حیات فانی سے رخصت ہوگئے اس پورے عرصہ میں وہ دلوں میں اللہ کی معرفت کو جاگزیں کرتے رہے، ان کی اصلاح کرتے رہے ان کو اللہ کا قرب عطا کرتے رہے، لوگوں کو علم ودین کی غذا فراہم کرتے رہے، اور بیمار دلوں کا مداوا اپنے تجربہ کی بنیاد پر بہتر ڈھنگ سے کرتے رہے۔

شاہ صاحب نے اپنے روحانی اثرات اور خداداد صلاحیتوں کی عطر بیزی سے اس چمنستان ہند کو لالہ زار کیا، ان کی مساعی سرزمین ہند میں مسلمانوں کی بیداری کے لئے محرک ثابت ہوئیں، اور اس کی وجہ سے مسلمانوں کے اندر اپنی عظمت رفتہ کی بازیابی کے لئے ایک داعیہ پیدا ہوا، شاہ صاحب کے عہد میں ہندوستان ان کے علمی وروحانی فیض کی وجہ سے پوری دنیا میں سربلند ہوا، اور ہمیشہ ان کے علمی وروحانی ورثہ پر فخر وانبساط محسوس کرتا رہے گا۔

شاہ صاحب کی شخصیت تاریخ کی پیشانی کا نور اور ان کے کارنامے جلوہ طور شمار کئے جاتے رہیں گے۔

ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں، ملکوں
ملنے کے نہیں، نایاب ہیں ہم

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ

۱۱۹۳ھ-۱۲۴۶ھ

اسماعیل شہید- ایک ایسی عظیم ہستی کا نام نامی ہے جس نے دہلی کے ایک بہت ممتاز علمی خانوادہ میں پرورش پائی، اورانہوں نے اس وقت علم ودین کی زمام قیادت وسیادت سنبھالی جب ان کی عمر آج کل کے ثانوی مدارس کے طلباء سے زیادہ نہ تھی، اسماعیل شہید۔ نام ہے اس مرد آہن کا، اس انقلابی شخصیت کا جس نے اس معاشرہ کے اندر ایمانی شعلوں کو بھڑکایا، جو دوسری سوسائٹیوں میں ضم ہوتا جارہا تھا اور شرک والحاد کے پرچم تلے پناہ لینے والا تھا، ایسے نازک ترین دور میں شاہ اسماعیل میدان عمل آئے، اور امت مسلمہ کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لی، اورانہوں نے اس امت کو شقاوت وبدبختی اور گمراہی وبے راہ روی سے نکال کر رشد وہدایت اور فلاح وکامرانی سے ہمکنار کیا۔

اسماعیل شہید کی ولادت ایسے وقت میں ہوئی جب امت خواب غفلت میں پڑی ہوئی تھی، لوگوں کے ذہنوں پر بدعت کی پیروی کا خمار چھایا ہوا تھا، اور دلوں پر شرک والحاد، مختلف روپ میں قابض ہو چکا تھا۔

حالت یہ تھی کہ امت مسلمہ اپنی بقاوزندگی کی جملہ صلاحیتوں کو کھو چکی تھی، اور دین کی اصل روح کو فراموش کر چکی تھی، زبوں حالی اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ ذہنوں پر ناامیدی چھائی جارہی تھی ایسے مشکل مرحلہ میں شاہ صاحب نے خود دار وغیور دلوں میں

ایمان کی غیرت اور جہاد کے شعلہ کو شعلۂ جوالہ بنانے کے لئے جدوجہد کی۔

شیخ الاسلام شاہ ولی اللہ بن عبدالرحیم کے خاندان میں اٹھارویں صدی عیسوی کے اواخر میں اس عارف باللہ اور عبقری امام جناب شاہ اسماعیل شہید کی پیدائش ہوئی وہ شاہ ولی اللہ کے پوتے اور ان کے صاحب زادے شاہ عبدالعزیز کے قابل فخر تلمیذ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو فراست ایمانی، عقیدہ میں رسوخ اور دین میں استقلال و پامردی عطا کی تھی، جب کہ یہ پختگی وصلابت علماء وصلحا اور صوفیاء میں بھی کم نظر آتی ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کو دین اور علم باطن کے بھی ایک وافر حصہ سے نوازا تھا، وہ اپنے اس علم کے ذریعہ خیر وشر میں تمیز کرنے اور حق و باطل اور سنت و بدعت کے فرق کو سمجھنے میں مدد لیا کرتے تھے۔

دین کی خدمت، بدعت کے ازالہ اور سنت کی ترویج کے لئے ان کی سرگرمیوں نے اہل علم اور عوام کے اندر ان کے قد کو بلند کیا، انہوں نے ان امور کے لئے اپنی تمام سعی وکوشش کی، اور اپنی آخری عمر میں انہوں نے دشمنان اسلام کے خلاف علم جہاد بلند کیا، اور ان کے مقابلہ میں سینہ سپر ہو گئے، اور انہوں نے اس راہ میں بڑی جوانمردی اور عزم وحوصلہ کا مظاہرہ کیا، یہاں تک کہ بالاکوٹ کے میدان میں اپنے خاندان ووطن سے دور پہاڑ کی چوٹیوں میں انہوں نے جام شہادت نوش کیا۔

شاہ اسماعیل شہیدؒ نے اپنے دور کے مسلمانوں کی زندگیوں کا جائزہ لیا تو وہ اس نتیجہ پر پہونچے کہ مسلمان اپنی اصل متاع کھو چکے ہیں، نہ اسلامی تعلیمات سے ان کو کوئی واسطہ رہا اور نہ ہی اس سے ان کا کوئی ربط باقی رہا، اور وہ خرافات وبدعات اور گمراہیوں میں غرق ہو چکے ہیں، حالت یہ ہو چکی ہے کہ خود شیخ کے بعض اہل خاندان بعض غیر اسلامی رسوم ورواج سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکے۔

چنانچہ شاہ صاحب نے ان برائیوں کے خاتمہ کے لئے خاص طور سے اپنے خانوادہ کو بچانے کی مہم شروع کی، اور اس کے علاوہ انہوں نے جمہور عوام کی بے راہ روی پر سخت گرفت کی، اور ان کے اندر سرایت کردہ گمراہیوں کی کھل کر وضاحت کی۔

اس مقصد کے لئے انہوں نے مسلمانوں کے ہر طبقہ میں خواہ وہ کتنا ہی پست

اور بے حیثیت طبقہ ہو، جد وجہد کی، اور اپنے اثر ونفوذ کا استعمال کرتے ہوئے لوگوں کو وعظ ونصیحت کی اور ان لوگوں کو سخت تنبیہ کی۔ ان لوگوں نے بھی حقیقت کو جان لیا، اور ان کو معلوم ہوگیا کہ جس طرز زندگی کو ان لوگوں نے اپنا رکھا ہے، اسلام اپنے پیروکاروں سے اس کا مطالبہ نہیں کرتا، شاہ صاحب نے جب عام لوگوں کی زندگی کا قریب سے جائزہ لیا اور دیکھا کہ لوگ اپنی توانائیوں کو ایسی چیزوں میں صرف کر رہے ہیں جو فضول ہیں۔ اور ساری چیزیں عقائد اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور اللہ تعالیٰ کے عظیم احکامات کے منافی ہیں، تو وہ اس تکلیف دہ حالت کا مقابلہ کرنے کے لئے کمربستہ ہو گئے اور لوگوں کو اصل دین اور صحیح عقائد کی دعوت دینے لگے، چنانچہ اس کے اچھے نتائج سامنے آئے اور انہوں نے حالات کا رخ پھیر دیا، اور قریب تھا کہ وہ حالت کو بالکل بدل دیں لیکن بعض دنیا پرست اور گمراہ لوگ ان کی راہ میں حائل ہوئے، اور اپنی باطل چیزوں سے لوگوں کو گمراہ کیا اور لوگوں کو باطل کے اپنانے پر ابھارا۔

لیکن شاہ صاحب نے اس کی ذرہ برابر پروانہ کی، اور انہوں نے اپنے خلاف اٹھتے ہوئے ہر قدم کو پسپا کر دیا، اور تمام باطل ہواؤں اور طوفانوں کا ایک پہاڑ کی طرح ثابت قدم رہ کر مقابلہ کیا، اور اللہ تعالیٰ کے راستہ میں انہوں نے جہاد چھیڑ دیا، اور دین کی عظمت کو بالا کرنے اور اس کی سربلندی کو دلوں میں بٹھانے کے لئے وہ مسلسل تگ ودو کرتے رہے، اس راہ میں ہر طرح کے مصائب وآلام کو جھیلتے ہوئے، آزمائشوں پر صبر کرتے ہوئے، تمام چیلنجوں کو قبول کرتے ہوئے قدم آگے بڑھاتے رہے، ایسا لگ رہا تھا کہ وہ زبان حال سے حضرت صہیبؓ کے اس شعر کو گنگنا رہے ہیں، اور گھات میں بیٹھے ہوئے، اپنے دشمنوں کو مخاطب کر کے کہہ رہے ہیں:

ولست أبالي حين أقتل مسلما

على أي جنب كان في الله مصرعي

شہادت ہے مطلوب ومقصود مومن

نہ مال غنیمت، نہ کشور کشائی

ان کا ایک عجیب واقعہ نقل کیا جاتا ہے کہ انہوں نے ایک بار چند بے پردہ خواتین کا ایک جلوس دیکھا، یہ خواتین ایک مکان میں داخل ہورہی تھیں، انہوں نے اس جلوس کے بارے میں لوگوں سے پوچھا تو پتہ چلا کہ یہ عورتیں کسبیاں ہیں اور محض لہو ولعب کی وجہ سے اس گھر میں جمع ہورہی ہیں، اور جب معلوم ہوا کہ یہ عورتیں مسلمان ہیں تو ان کی بے پردگی اور بے حیائی پر ان کے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا، اور فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ ہم سے روز قیامت پوچھے کہ ہم نے ان تک اسلام کی بات نہیں پہونچائی، اور ان کی اس بے راہ روی پر ان کو متنبہ نہ کرسکے، تو ہمارا کیا جواب ہوگا؟

انہوں نے فرمایا کہ خدا کی قسم میں انہیں سمجھانے کے لئے اس گھر میں جاؤں گا ان کے بعض دوستوں نے اس سے روکا، اور ان سے کہا کہ اس سے آپ کی بدنامی ہوگی، اور تہمت طرازی کا لوگوں کو موقع ملے گا، تو آپ نے جواب دیا، کہ اسماعیل کو اس کی پروا نہیں ہے اور اپنے نفس کو مخاطب کرکے کہا، کہ اگر مجھے اندیشہ ہو کہ مجھے اس راہ میں قتل کردیا جائے گا اور ہمارے ٹکڑے ٹکڑے کردیئے جائیں گے، تو کیا میں اس کام کے کرنے سے باز آجاؤں گا، ہرگز نہیں، ہرگز نہیں۔

رات کے وقت شاہ اسماعیل نے اپنا لباس وبھیس بدلا، اور ان کے دروازے تک ایک درویش کی شکل میں پہونچے، دروازہ پر دستک دی، اس وقت بھی وہ عورتیں لہو ولعب اور لذت کوشی میں مدہوش وبدمست تھیں، جب انہوں نے دستک سنی، تو دستک دینے والے کے بارے میں دریافت کیا۔ شاہ صاحب جواب دیا کہ میں درویش ہوں، میں تم لوگوں کو کچھ سنانے آیا ہوں اور میں تمہارے سامنے اپنے پہلوانی فن کا مظاہرہ کرنا چاہتا ہوں، انہوں نے دروازہ کھول دیا اور شاہ صاحب اندر چلے گئے، انہوں نے ان معمر مومن عورتوں کے بارے میں پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ کوٹھے پر بعض نوجوان لڑکوں کے ساتھ مشغول ہیں، شاہ صاحب ان کے پاس پہونچے، اس وقت لہو ولعب اور بہت سی برائیاں جاری تھیں، بعض عورتوں نے ان کو پہچان لیا، اور بہت خاموشی اور احترام کے ساتھ ان کے

اردگرد بیٹھ گئیں، اوران کے آنے کا سبب معلوم کیا۔

اس وقت شاہ صاحب نے حکمت کے ساتھ اپنے وعظ کا آغاز کیا، اور یہ گفتگو بہت ہی موثر اور طاقت ور تھی، اور چند ہی لمحوں کے بعد ان عورتوں کی آہ و بکا اور گریہ وزاری کی آوازیں سنائی دینے لگیں، اور فضا پر خوف کے بادل چھا گئے، اور حالت بالکل برعکس ہوگئی۔

اوران میں سے ہر ایک عورت ایمان کے دائرہ میں نئے سرے سے داخل ہوئی، اور انہوں نے گزری ہوئی زندگی پر اپنے رنج وغم کا اظہار کیا، اوراللہ تعالیٰ سے توبہ واستغفار کی۔

اور شاہ صاحب سے بیعت کی، اور جب شاہ صاحب نے اپنی گفتگو ختم کرتے ہوئے کہا کہ گناہ سے توبہ کرنے والا بالکل ایسا ہوجاتا ہے گویا کہ اس نے گناہ ہی نہ کیا ہو۔ (التائب من الذنب کمن لا ذنب له) تو اس کو سن کر ان طوائفوں نے نیک نوجوانوں سے شادیاں کرلیں اور نیک بختی کے ساتھ سکون وآرام کی زندگی گزارنے لگیں، جو عورتیں سن رسیدہ تھیں، انہوں نے اپنے معاش کے لئے بعض دوسرے فنون اور ذرائع معاش اختیار کرلئے۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد کی، نہ وہ مایوسی کا شکار ہوئے اور نہ اس معاملہ میں انہوں نے کبھی بزدلی کا مظاہرہ کیا، بلکہ اس سے ان کے اندر عزم وحوصلہ اور طاقت وقوت میں اضافہ ہوا، اورانہوں نے اپنے کار دعوت کو زیادہ وسیع کردیا، لوگ ان کے حلقۂ دعوت وارشاد میں داخل ہوگئے، اوران کے پیغام کی اشاعت میں ان کا تعاون کیا، اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ خیر کا معاملہ فرمایا، اوران کی مساعی کو استحکام ودوام عطا کیا، اوراللہ تعالیٰ نے ان کو اس زمانہ کے بڑے بڑے مشائخ کا سرخیل اور اپنے زمانہ کے اہم اولیاء میں شامل فرمایا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ خیر کا معاملہ فرمایا اوران کے کارناموں کو دوام بخشنے کے لئے اس زمانہ کے ایک بڑے پیرومرشد اور عارف باللہ کو ان تک پہونچادیا۔

شاہ صاحب نے ان کے نور ایمان سے فیض حاصل کیا اپنے ایمان کو تقویت پہونچائی، اور اپنی ذات کو پہلے سے زیادہ فنائیت کے جذبہ سے لبریز کر دیا۔

اپنے نیک بندوں کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ وہ باہم متعارف ہو جاتے ہیں تا کہ فساد کی اصلاح اور عدل کے قیام کے لئے ایک دوسرے کی مدد کریں، اور لوگوں کو اپنے مذہب کے فرائض وواجبات سے آگاہ ومتنبہ کریں، اللہ تعالیٰ نے شاہ اسماعیل صاحب کے دل میں یہ خیال ڈالا کہ ان کا تعلق کسی ایسے شیخ کامل سے ہونا چاہئے جس سے اپنے معاملات میں وہ رجوع کیا کریں، اور ان کے سامنے اپنی ضروریات کو رکھا کریں، اور ان سے اپنی زندگی میں ایک نئی جان پیدا کیا کریں، اور طاقت وزندگی حاصل کیا کریں، تا کہ عمل دعوت میں یہ چیز ان کی معاون ثابت ہو، اور زندگی کے میدان میں ان کے لئے دست وبازو کا کام کرے۔

چنانچہ شاہ اسماعیل، حضرت سید احمد شہید کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور ان سے اسلام کے دفاع وجہاد فی سبیل اللہ کے لئے بیعت کی، اور ایک شاگرد کی طرح ان کی صحبت وخدمت میں رہے، جب ان کی صلاحیتیں نکھر گئیں، اور ان کے دل میں فنا فی اللہ اور خدمت کے جذبہ کی چنگاری فروزاں ہوگئی، جس کے نتیجہ میں بے چینی، بے کلی، تڑپ اور قلق رات دن ان کا مقدر بن گئی اور ان کے دل کی بھٹی میں ہر لمحہ خدمت دین کی آگ بھڑکنے لگی، اس وقت وہ تبلیغ اسلام اور اصلاح حالات، تربیت نفوس میں اور زیادہ طاقت وولولہ کے ساتھ سرگرم ہو گئے، اور اس کا نفع امت کے ہر طبقہ تک پہونچا، ان کے مخالف عناصر کم ہوتے گئے، اور دشمنی کے گھنیرے بادل چھٹنے لگے، اور اسلامی معاشرے میں ایک جیتی جاگتی روح کارفرما نظر آنے لگی جس کا سرچشمہ اسماعیل شہید اور سید احمد شہید کی ذات تھی۔

حضرت سید احمد شہید سے ملاقات کے کچھ ہی عرصہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو حج کے لئے حجاز مقدس کے سفر سے سرفراز فرمایا یہ سفر محض ایک دعوتی سفر تھا، انہوں نے اس سفر کا عام اعلان کیا اور مولانا عبدالحی اور شاہ اسماعیل کو لوگوں میں حج کا اعلان کرنے کے

لئے بھیجا، اور لوگوں کو سید صاحب کے قافلہ میں شامل ہونے کے لئے ابھارا، اس دعوت کے نتیجہ میں بہت سے لوگ اس مبارک سفر کے لئے اس قافلہ سخت جان میں شریک ہو گئے، یہ سفر تحریک جہاد کی جانب پہلا قدم تھا جس کی قیادت اس سرزمین ہند پر ظالموں اور باغیوں کے خلاف حضرات شہیدین نے کی، شاہ اسماعیل سب سے پہلے فوجی اور سرفروش تھے جنہوں نے اس معرکۂ حق اور تحریک آزادی میں سب سے پہلے قدم رکھا تا کہ غیر اللہ کی عبادت سے خود کو بچایا جائے، اور باطل معبودوں، بت پرستی اور کفر وشرک کے اثرات سے معاشرہ کو پاک وصاف کیا جائے، انہوں نے باطل طاقتوں سے ٹکر لی، اور اس وقت اسلامی معاشرہ میں پھیلے ہوئے فاسد افکار وخیالات اور گمراہ رجحانات پر انہوں نے کھل کر تنقید کی اور حق وہدایت کے راستوں کو لوگوں کے سامنے واضح کیا تا کہ لوگ امن وسکون کے ساتھ اس میں داخل ہو جائیں تیرہویں صدی میں ہندوستان کی تاریخ میں یہ ایک نئی فتح وکامرانی اور اسلامی دعوت کے لئے ایک بڑی کامیابی تھی۔

لیکن جب جب حق کی صدا بلند ہوتی ہے تو اس کی راہ میں رکاوٹ بننے والی چیزیں اپنا سر اٹھاتی ہیں، شاہ صاحب کی اس دعوت کے خلاف بدعتی علماء وشیوخ کا وہ طبقہ سامنے آیا جو لوگوں کے ذہنوں میں اوہام وخرافات کے بیج بویا کرتا تھا، وہ اسماعیل شہید کے خلاف آوازیں بلند کرنے لگے، اور ان کے دین وعقیدہ پر طعنہ زنی کرنے لگے، حتی کہ ان کو ملحد وزندیق گردانتے سے بھی باز نہ آئے، اور شاہ صاحب کے اندر شعلہ زن ایمان کی چنگاری کو خاکستر کرنے کے درپے ہو گئے، اور انہوں نے یہ سازش کی کہ ان کے ولولے، جذبات اور توانائیوں کو خدمت دین کے بجائے آپسی نزاع اور انتشار میں لگا دیا جائے، لیکن شاہ اسماعیل نے ان پہلوؤں پر کوئی توجہ نہ کی، انہوں نے لوگوں کے اقوال، اتہام طرازی کی کوئی پروانہ کی بلکہ اپنی تمام تر توجہ تبلیغ اسلام اور اعلاء کلمۃ اللہ اور اصلاح فساد اور عقائد کی درستگی نیز دلوں میں ایمان ویقین کی بازیابی پر صرف کی، اور یہ تمام امور قرآن کریم اور سنت مطہرہ کی روشنی میں انجام دئے۔

وہ ہر جمعہ اور منگل کے روز جامع مسجد دہلی میں وعظ کہا کرتے تھے، اس میں بڑی تعداد میں لوگ شرکت کرتے تھے، یہاں تک کہ بہت سے ایسے تعلیم یافتہ افراد اور علماء جو شاہ صاحب کو پسند نہ کرتے تھے اور ان کی دینی سرگرمیوں کی مخالفت کرتے تھے وہ بھی اس وعظ کی محفل میں شریک ہوتے، تاکہ ان کو شیخ کی اہانت اور ان کی گرفت کا اگر کوئی موقع میسر آجائے تو اس سے فائدہ اٹھائیں، لیکن اپنے منصوبوں میں انہیں کبھی کامیابی نہ مل سکی، اور شاہ صاحب اپنے پرتاثیر وعظوں سے لوگوں کے دلوں کی بھٹی میں دین کے جذبات کی آگ بھڑکاتے رہے۔

اسی کے ساتھ وہ جنگی فنون اور جنگ کے دوران فوجیوں کو پیش آنے والے مسائل ومشکلات کی مشق کیا کرتے تھے، اور اس کی وجہ سے فاقہ کشی، بھوک، پیاس، بے خوابی اور تھکن وغیرہ جیسی بے شمار مشقتوں کو جھیلتے تھے۔

جب شرک وبدعت کے بادل بڑی حد تک چھٹ گئے، اور لوگوں نے باطل عقیدوں اور فاسد خیالات کی حقیقت کو جان لیا جس میں وہ اب تک غرق تھے، اور حالات بہتر ہوگئے تو شاہ صاحب نے لوگوں کو حکمت وموعظت کے ساتھ جہاد فی سبیل اللہ کی دعوت دینی شروع کی، اور اب ان کے اکثر مواعظ جہاد کے مفاہیم اور اس کے فضائل وغیرہ پر مشتمل ہونے لگے، انہوں نے لوگوں کو اس پہلو سے اتنا سمجھایا کہ ان کی باتیں دلوں میں نقش ہوگئیں، اور لوگوں کے دلوں میں قتال، جانثاری اور خدا کی راہ میں شہادت کا شوق انگڑائیاں لینے لگا، اور ہر فرد یہ آرزو کرنے لگا کہ وہ خدا تعالیٰ کے راستہ میں جہاد کرے، اور اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے علَم کے نیچے شہادت نصیب ہو، اور اس کا شمار بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں شہداء وصدیقین میں کیا جائے۔

جب جذبہ جہاد دلوں میں خوب جاگزیں ہوگیا، اور جب شہادت کی آرزو میں شاہ صاحب کا پیمانہ صبر چھلکنے لگا تو وہ اپنے مرشد سید احمد شہید کے پاس گئے اور اپنی جہاد کی تیاری سے ان کو مطلع کیا، دونوں نے پشاور، پنجاب اور سندھ کی طرف سے افغانستان اور

بلوچستان کا قصد کیا اور مجاہدین کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ نکلے انہوں نے اسلام دشمنوں کے ساتھ قتال کیا، وہ صحابہ وتابعین کی یاد کو تازہ کرنا اور قرن اول کی تاریخ کو اس سرزمین پر دہرانا چاہتے تھے، اور جب جب وہ کسی گاؤں سے گزرتے لوگوں کو جہاد کی دعوت دیتے، اور سکھ حکومت کے خلاف محاذ قائم کرنے کے لئے وہ لوگوں کو اپنے ساتھ شریک کرتے، لوگوں نے ان کی دعوت پر لبیک کہا، اور ان کے ساتھ چلنے اور دشمن سے جنگ کرنے کے لئے عزم ظاہر کیا۔

پنجاب کے باشندوں اور وہاں کے قبائل نے ان مجاہدین کے اندر اپنے مقصد کی تکمیل دیکھی، وہ بھی کسی ایسے مرد آہن کے منتظر تھے جو اس جنگ میں ان کا ساتھ دے سکے، اور موجودہ حکومت وحالات کے خلاف جہاد کر سکے، چنانچہ انہوں نے جہاد کیا اور شاہ اسماعیل اعداء اسلام کے خلاف اس معرکہ میں فوجی جنرل تھے تو دشمنوں کو راہ فرار اختیار کرنی پڑی اور وہ بری طرح ذلت وخواری کے ساتھ بھاگے، اور پنجاب میں ایک چھوٹی اسلامی حکومت قائم ہوگئی، جس کا دارالسلطنت پشاور کو بنایا گیا، لیکن ابھی جنگ جاری تھی، اور مسلمانوں کی ایک جماعت وادی بالاکوٹ میں دشمنوں سے معرکہ آرا تھی اور دوسری جماعت پشاور کی سرزمین پر عدل وانصاف کے قیام اور شریعت اسلامیہ کے نفاذ کے لئے جدوجہد کررہی تھی۔

قریب تھا کہ پنجاب کے ایک بڑے حصہ پر اور بعض دیگر علاقوں میں مجاہدین کا مکمل تسلط ہوجاتا لیکن جس کی امید بھی نہ تھی وہ ہوکر رہا، بعض عناصر اور قبیلوں نے اسلامی حکومت کے قیام میں رکاوٹ پیدا کردی، اور انہوں نے مسلمانوں سے غداری کی اور کافروں اور اعداء اسلام سے مل گئے، اور انہوں نے مجاہدین کے تمام راز انہیں فراہم کردیئے، انہوں نے ان رازوں کو مدنظر رکھ کر مجاہدین کے خلاف صف آرائی کی، اور ہر چہار جانب سے وادی بالاکوٹ میں ان کا محاصرہ کرلیا، اور دونوں میں زبردست فیصلہ کن جنگ چھڑ گئی، اس جنگ میں خدا کے نیک مجاہدین کی شجاعت اور شاہ اسماعیل کا ولولہ کھل کر

سامنے آیا۔

انہوں نے میدان جنگ میں اسلامی افواج کی قیادت کی، اور وہ فنون حرب کے ماہر، اور حد درجہ بہادر انسان تھے، انہوں نے دشمن سے خطرناک جنگ لڑی یہاں تک کہ انہوں نے جام شہادت نوش کیا، اور حق کے راستہ میں شہادت کی ان کی آرزو پوری ہوئی، اور اس طرح وہ شہداء کی فہرست میں شامل ہو گئے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل الله اموات بل احیاء ولکن لا تشعرون۔"
(بقرۃ) اللہ کی راہ میں شہید ہونے والوں کو مردہ مت کہو، وہ زندہ ہیں، لیکن تمہیں اس کا شعور نہیں ہوتا۔

شاہ اسماعیل شہیدؒ اللہ کے جوار رحمت میں چلے گئے، اور آخر کار وہ شہداء وصدیقین کے منصب پر فائز ہو گئے، اور انہوں نے اسلام کی تاریخ میں اپنا نام درج کرالیا۔ اور تاریخ کے صفحات پر وہ جہاد وقتال، آزادی وعدالت کے ایسے کارنامے نقش کر گئے جو ہمیشہ ہمیش باقی رہیں گے، اور آنے والی نسلیں اور قومیں عزت وسربلندی کے حصول کے لئے ان سے فیض اٹھاتی رہیں گی اور اقبال کے یہ الفاظ ان کے کانوں میں گونجتے رہیں گے ۔

سبق پڑھ پھر صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

سید احمد شہید رحمہ اللہ تعالیٰ

۱۲۰۱ھ-۱۲۴۶ھ

تیرہویں صدی ہجری ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں انتہائی نازک اور دشوار گذار صدی گذری ہے، اس وقت مسلمانوں کی سیاسی بالادستی اپنی آخری سانسیں لے رہی تھی اور مسلسل ایک ہزار سال تک ہندوستان میں اسلامی حکومت کا بلند ہونے والا ستارہ اقبال ڈوبنے کے قریب تھا، اسلامی معاشرہ میں غلط رسم ورواج اور بدعات وخرافات نے جگہ بنالی تھی اور لوگوں کے دلوں میں شرک وبت پرستی کے اثرات جگہ پانے لگے تھے، یہاں تک کہ جاہلیت نے دوبارہ اپنے بال وپر نکالنے شروع کردئے تھے، اور اس معاشرہ میں حلال وحرام کا فرق باقی نہیں رہا تھا، اسلامی شعائر کا تقدس بھی پامال ہورہا تھا، اور عقائد اسلامی سمٹ کر محض قبروں کی زیارت اور ان کی سجدہ ریزی تک پہونچ گئے تھے۔

الحاصل حالات بہت دگرگوں ہوچکے تھے، ہندوستان میں اسلامی آثار وتشخص کا قلع قمع ہورہا تھا، مسلمان شرک وبت پرستی کے دہانے پر کھڑے تھے، اگر اس موقع پر علماء وصلحاء اور اصحاب عزیمت کی مساعی رنگ نہ لاتیں تو اس تند وتیز سیلاب کو کوئی طاقت روکنے والی نہ تھی، یہ ایسی مساعی تھیں جن کو تاریخ اسلامی ہند کبھی فراموش نہیں کرسکتی، اور مسلمان کسی بھی حالت میں اس سے صرف نظر نہیں کرسکتا ہے۔

ان ناگفتہ بہ حالات میں ایک صاحب علم وصلاح میدان کارزار میں قدم رکھتا ہے جو تمام مادی ساز وسامان اور وسائل سے تو عاری ہوتا ہے لیکن اس کا دل ایمان ویقین کی طاقت سے مالا مال ہوتا ہے جس سے بڑھ کر کوئی طاقت وقوت نہیں اور جس سے زود اثر کوئی اسلحہ نہیں۔

یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

یہ مرد پرعزم، شرک وبدعت، نفاق ومنکرات سے بھری ہوئی خطرناک موجوں میں کود پڑتا ہے اور اس کے دھارے کا رخ موڑ دیتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں کے دلوں میں ایمان کی چنگاریاں روشن کر دیتا ہے۔ اور لوگوں کو اصلاح حال کے لئے آمادہ کرتا ہے اور وہ سرد وخاکستر دلوں کے اندر جہاد وقتال کے شعلے بھڑکاتا ہے چنانچہ حالات کا رخ بدلتا ہے، اور لوگوں کی زندگیوں میں انقلاب رونما ہونے لگتا ہے۔

یہ عظیم شخصیت سید احمد شہید کی تھی وہ اپنے رفیق خاص شاہ اسماعیل شہیدؒ کے ساتھ تجدید واحیائے دین کے لئے میدان عمل میں اترے، اس وقت پنجاب میں سکھوں کی حکمرانی تھی، اور ہندوستان کے اندر انگریز حکومت کرتے تھے، وہ روز بروز اسلامی شعائر کو ملیامیٹ کرتے اور اسلام پر شکوک وشبہات کے دروازے کھولتے جارہے تھے، وہ مسلمانوں کو مختلف دھڑوں اور فرقوں میں تقسیم کر دینے کی سیاست چل رہے تھے تاکہ بغیر کسی معرکہ و خونریزی کے مسلمانوں کا امتیاز وتشخص ختم ہوجائے۔

ایک طرف حالات کا یہ رخ تھا دوسری جانب خود مسلمان اپنی زندگی کے نازک دور میں قدم رکھ چکے تھے، ان کے اندر مذہبی بے راہ روی اور اخلاقی انارکی بڑی حد تک سرایت کر چکی تھی اور اسلامی سماج کو ایسا لاعلاج مرض لاحق ہو چکا تھا جو اس کا کام تمام کئے بغیر ختم ہونے والا نہ تھا، فسق وفجور اور گناہ وسرکشی ان کے معاشرہ کا ایک جز بن چکی تھی، لوگ معاصی کے ارتکاب میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے اور وہ شرک وبت پرستی پر فخر کرتے تھے جس نے ان کو ہر چہار جانب سے گھیر رکھا تھا، ہر مسلم خاندان میں علی الاعلان شراب اور منشیات عام تھی، اس نے مسلمانوں کے اندر عظیم اخلاقی بحران پیدا کر دیا تھا اور اسلام اور قرآن کو ماننے والے کسی بھی مسلمان کے بارے میں اس حد تک سوچا تک بھی نہ جاسکتا تھا جو وہ انجام دے رہا تھا، مسلمان تمام زندہ قوموں اور فاتح

نسلوں کی خصوصیات سے کورے ہو چکے تھے، پورے سماج میں عام طور پر بدکاری و بے حیائی عام تھی، اور مالدار و نادار سبھی طبقے زنا و حرام کاری کرنے میں عار نہیں محسوس کرتے تھے، معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی نشہ میں مدہوش ہوں اور انہوں نے عزت و حیا کے لبادہ کو اتار کر پھینک دیا ہو اور بے غیرتی کی وجہ سے وہ بالکل عریاں ہو گئے ہوں، ہر کس و ناکس گناہ اور اخلاقی جرائم میں ملوث تھا، دین اخلاق کا اس کو بالکل پاس و لحاظ نہ تھا، پوری کی پوری زندگی محض تفریح اور لہو لعب سے تعبیر تھی، وہ محض جانوروں جیسی زندگی بسر کر رہے تھے ان کے سامنے شکم کی شہوت اور بوالہوسی کے علاوہ کوئی مقصد حیات نہ رہا تھا۔ مسلمان دینی اور اخلاقی طور پر اس قدر زوال پذیر ہو چکے تھے کہ گویا بدبختی ان کا مقدر بن چکی ہے اور آج تک اس کے دور کے اثرات ہندوستانی معاشرہ میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

سیاسی اعتبار سے بھی مسلمان زوال پذیر ہو چکے تھے، اختلاف رائے اور بے اعتمادی ان کے اندر حد درجہ سرایت کر چکی تھی اس وجہ سے سیاست و حکومت کے میدان میں وہ بے حیثیت ہو کر رہ گئے تھے نہ ان کا کوئی لیڈر تھا نہ قائد، جو ان کو عزت و سیادت کے علم کے نیچے جمع کر سکے، اور ان کو دینی عظمت و سربلندی اور ایمان و علم کی بیش بہا دولت و نعمت کے حصول کی دعوت دے، خود کمزور مسلمانوں کے اندر سیکڑوں فتنوں نے سر اٹھا لیا تھا، اور دہلی سے دکن تک مرہٹوں کے زیر نگیں ہو کر وہ ذلت و رسوائی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے تھے، اور پنجاب سے لیکر افغانستان تک سکھوں کی بالادستی قائم ہو چکی تھی، اور ساحلی حدود پر انگریزوں کا تسلط تھا، اور ساری قومیں اسلام اور مسلمانوں سے اپنی کھلی ہوئی دشمنی نکالنے اور تاریخ کو مسخ کرنے کے مختلف حربوں سے آشنا تھیں۔

ان بدترین حالات کو تاریخ اسلامی نے زیادہ دنوں تک چلنے نہ دیا اس لئے کہ دیار ہند میں اسلام کے بقاء کے لئے حکمت الٰہی اور منشاء خداوندی کچھ اور ہی تھا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس مہم کو سر کرنے اور اس ملک کو حقیقی طور پر فتح کرنے کے لئے حضرت سید احمد شہیدؒ کو پیدا فرمایا۔

حضرت سید احمد شہیدؒ کے ذریعہ تیرہویں صدی ہجری میں ایک بہت بڑی اسلامی تحریک وجود میں آئی، اس تحریک کی جڑیں بہت گہرائیوں تک پہونچ گئی تھیں اس تحریک کو قبولیت عام حاصل ہوئی، اور اپنی پرزور تاثیر سے اس تحریک نے مسلمانوں کے تن مردہ میں روح پھونک دی، اور اس نے اپنی قوت عمل کے ذریعہ بے جان دلوں میں زندگی کی لہر دوڑا دی۔

یہ تحریک بڑے نازک وقت وجود میں آئی اور اگر اس میں ذرا بھی تاخیر ہوتی تو ہندوستان میں اسلامی دعوت کو ایسا دھچکا لگتا کہ اس کے لئے از سر نو یہاں جم پانا مشکل ہوجاتا اور اس کے اعوان ومددگار ڈھونڈھے نہ ملتے، حسن اتفاق سے اس کا وجود ایسے وقت میں ہوا جب اس تحریک کو آگے بڑھانے میں تعاون کرنے والے بعض سرفروش اور جیالے اس کے پرچم تلے آگئے، یہ ایسے مردان کار تھے جو اس تحریک کے عزائم کو بروئے کار لانے کے لئے جان کی بازی تک لگانے کے لئے تیار تھے۔ یہ کوئی علاقائی اور محدود تحریک نہ تھی، بلکہ ہندوستان کی یہ وہ پہلی اسلامی تحریک تھی جو اخلاقی انارکی اور سامراجیت کے خلاف اس روئے زمین پر اسلامی خلافت اور الٰہی حکومت برپا کرنے کا عزم لے کر اٹھی تھی، اور صدیوں کے بعد پہلی بار اسلامی مملکت کے قیام کے لئے یہ ایک عملی اور حقیقی کوشش تھی جو منظر عام پر آئی۔

اس تحریک کو باقاعدہ طور پر سمجھنے اور اس کے مقاصد سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم سید احمد شہیدؒ کی زندگی کے اوراق الٹیں اور ان کی ذاتی شخصیت اور زمانے کے حالات وکوائف سے واقفیت حاصل کریں۔

سید احمد شہیدؒ ماہ صفر ۱۲۰۱ھ میں رائے بریلی ضلع کے ایک چھوٹے سے گاؤں تکیہ میں پیدا ہوئے، سید صاحب کا سلسلہ نسب سیدنا امام حسن بن علی بن ابی طالب سے جا کر ملتا ہے، سید صاحب کے جد اعلیٰ سید قطب الدین محمد الحسنی نے قطب الدین ایبک اور سلطان شمس الدین کے زمانے میں ۶۰۷ھ میں اپنے چند رفقاء واصحاب کے ساتھ غزنہ

سے ہندوستان ہجرت کی، اور یہاں دونوں بادشاہوں کی جانب سے ان کا پرزور استقبال ہوا اور سید قطب الدین اور ان کی جماعت کو بڑے اکرام واعزاز سے نوازا گیا۔

دہلی میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد اپنے عزم کی تکمیل کے ارادہ سے مشرقی ہندوستان کی طرف رخ کیا اور الٰہ آباد کے ایک گاؤں کڑا پہونچے جو اس وقت کی حکومت کا دارالسلطنت تھا۔ انہوں نے اس پر حملہ کیا اور اسے اور اس کے قرب وجوار کے علاقوں کو فتح کرلیا اور اس علاقہ کو اسلامی حکومت سے ضم کردیا، اور اپنے جہاد کے ایک رمز اور غلبہ واقتدار کی علامت کے طور پر اسے اپنا وطن قرار دیا۔

سید احمد شہیدؒ جب چار سال کے ہوئے تو مکتب میں ابتدائی تعلیم کی غرض سے داخل کئے گئے اور ورزش اور جسمانی مشقوں کے علاوہ نیزہ بازی وغیرہ کی بھی مشق شروع کردی، جب سن شعور کو پہونچے تو ان کے اندر خدمت خلق کا جذبہ موجزن ہوا، وہ حاجت برآری کے لئے کمزوروں اور فقیروں کے پاس جاتے اور ان کی ضرورت پوری کرنے کے لئے ان سے ضروریات دریافت کرتے، اس سلسلے میں ان کی عجیب وغریب حکایات ہیں جن کو سن کر سخت حیرت واستعجاب ہوتا ہے۔

انہوں نے اپنی عبادات اور ذکر ونوافل کے ذریعہ بہت سے عابدوں اور اللہ والوں پر سبقت حاصل کرلی، حالانکہ ابھی وہ بہت کم عمر تھے، وہ کم سنی ہی سے نوافل سے اپنی راتوں کو زندہ کرتے اور دن بھر لوگوں کی خدمت، تلاوت قرآن اور دعا ومناجات میں مصروف رہتے، وہ قرآن مجید کو پورے تدبر اور غور وفکر سے پڑھتے تھے۔

تقدیر الٰہی کے تحت سید صاحبؒ اسلام کی پاسبانی کے لئے ایک مرد مجاہد اور غازی بن کر ابھرے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کو عسکری مشقوں کا موقع فراہم کیا، اس لئے کہ جہاد میں محض جذبات ہی کافی نہیں ہوتے بلکہ شجاعت وجوانمردی اور جنگی فنون میں مہارت ان جذبات سے کہیں زیادہ اہم ہوا کرتی ہے، چنانچہ سید صاحب کی عادت تھی کہ وہ روزانہ کئی گھنٹے جسمانی ورزش کرتے تھے اور ریاضت کے مختلف طریقوں کے مطابق وہ

ورزش کی مشقیں کرتے تھے، نیزہ بازی، شہ سواری، بھاری چیزوں کا اٹھانا، دوڑ اور تیراکی وغیرہ ان کے روزانہ کے معمولات تھے۔

اس طرح وہ روزانہ اپنے دل میں ایک نیا جوش وولولہ پیدا کرنے کے عادی بن چکے تھے، وہ جہاد کی جانب اپنے اندر بہت زیادہ میلان پاتے تھے، اور اس قدر جذبۂ جہاد سے سرشار تھے کہ بہت جلد اس میں شرکت کے مشتاق تھے، ایک بار رائے بریلی کے ایک گاؤں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین فساد ہوگیا تو وہ فوراً اپنی والدہ سے جہاد وقتال کی اجازت طلب کرنے لگے، ماں نے ان کو اس کی اجازت دے دی لیکن ان کے وہاں پہونچنے سے پہلے ہی فساد کا خاتمہ ہو چکا تھا۔

جب سید احمد شہیدؒ جوان ہونے لگے تو انہوں نے خود کو تن تنہا پایا ان کے والد پہلے ہی وفات پا چکے تھے، چنانچہ حالات کی وجہ سے انہیں فکر معاش نے آ گھیرا، اور اس مقصد کے لئے انہوں نے اپنے رشتہ داروں کی ایک جماعت کے ساتھ لکھنؤ کا سفر کیا تا کہ وہاں کسی پیشہ وغیرہ سے منسلک ہوکر حاجت برآری کریں۔ اور اپنی اور اپنے خاندان کی ضروریات پوری کریں انہوں نے اس راہ میں جس قدر مشقتیں برداشت کیں انہیں بس خدا ہی جانتا ہے۔ اسی سفر میں ان کے ذریعہ بہت سی کرامتیں اور خلاف عادت باتوں کا بھی ظہور ہوا جس سے ان کے تزکیہ نفس اور روحانیت کے بلند مرتبہ پر فائز ہونے کا پتہ چلتا ہے اور دنیا سے ان کی بے رغبتی اور آخرت کی جانب متوجہ ہو جانے کا علم ہوتا ہے۔

تقدیر ان کے اس قافلہ کو دہلی لے گئی، جہاں حسن اتفاق سے شاہ ولی اللہ کا خاندان تاریکی میں روشنی کی ایک کرن کی طرح تھا دہلی شہر اس زمانہ میں علماء واولیاء اللہ اور علوم ومعارف کا مرکز تھا وہاں ہندو بیرون ہند سے شمع علم کے پروانے آتے تھے اور اپنی پیاس بجھاتے تھے، چنانچہ سید صاحب بھی شاہ عبدالعزیز بن شاہ ولی اللہ کی خلوت گاہ پہونچے، پھر جب شاہ صاحب کو پتہ چلا کہ ان کا تعلق رائے بریلی کے سادات کے خانوادہ سے ہے تو وہ خود سید صاحب کے استقبال کے لئے آگے بڑھے اور ان کا بہت اکرام کیا، سید

صاحب نے شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر سے استفادہ کرنا شروع کر دیا۔ اور وہ روحانی علوم اور خداوندی مبشرات کو حاصل کر کے اور مجاہدوں اور ریاضتوں کے ذریعہ بہت تھوڑی سی مدت میں باطنی و روحانی علوم کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہونے کے لائق ہو گئے۔

تاریخی روایات کے مطابق تعلیم سلوک کے دوران حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے حسب معمول تصور شیخ کی تعلیم دی، سید صاحب نے نہایت ادب سے عرض کیا کہ حضرت اس میں اور بت پرستی میں کیا فرق ہے؟ شاہ صاحب نے اس سے انکار کیا اور حافظ کا یہ شعر پڑھا۔

بہ مے سجادہ رنگیں کن، گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نہ بود زراہ ورسم منزلہا

سید صاحب نے فرمایا: شرک کی کسی طرح ہمت نہیں ہو سکتی، ہاں کتاب وسنت اور اجماع امت سے کوئی سند لائیں اور اچھی طرح سے اطمینان ہو جائے کہ دونوں ایک چیز نہیں تو میرے لئے اس کا قبول کرنا اور عمل کرنا ممکن ہوگا، شاہ صاحب نے یہ سن کر سید صاحب کو فرط مسرت سے گود میں لے لیا اور کئی مرتبہ پیشانی کا بوسہ دیا اور فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وانعام سے تم کو ولایت انبیاء سے نوازا، سید صاحب نے اس کی تشریح چاہی تو شاہ صاحب نے اس کی تفصیل اس طرح فرمائی:

''سادہ اور مطلق ولایت تو یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے بندوں میں سے کسی بندے کو دوسرے بندوں کے مقابلے میں اپنے قرب سے برگزیدہ کرے، اس برگزیدگی کی نشانی یہ ہے کہ اللہ کی محبت اس کے دل کی گہرائی میں اس طرح پیوست ہو جائے کہ اس کو دنیا اور دنیا کی چیزوں کی طرف کوئی توجہ نہ رہے اور اولاد اور جاہ ومال کی محبت اس کے دل سے مٹ جائے، اپنے نفس، قلب، جوارح اور اعضاء سے وہ قرب الٰہی کا جویا اور رضائے خداوندی کا طالب بن جائے، اور اس میں وہ اس طرح مشغول ومنہمک ہو جائے کہ عوام الناس اس کو مجنون ودیوانہ سمجھیں۔''

تبع تابعین میں سے ایک شخص نے حضرت سفیان ثوریؒ سے کہا "صحابہؓ اور ہماری کیا نسبت ہے؟ فرمایا: اگر تم ان کو دیکھتے تو دیوانہ سمجھتے اور اگر وہ تم کو دیکھیں تو کافر ومنافق سمجھیں اور تمہارے سلام کا جواب دینے کے روادار نہ ہوں، اسی طرح سے صاحب ولایت تو نفس کے مجاہدے، صوم وصلوٰۃ، کثرت نوافل اور خدمت خلق میں مشغول ہوتا ہے، آیت کے مضمون کے مطابق "واذا خاطبهم الجاهلون قالوا سلاما (۲۵:۹۳) یعنی جب جاہل ان کے منہ لگتے ہیں تو وہ کہتے ہیں، بھائی سلام ہو (ہم کو معاف کرو) مجرمین وفاسقین سے تعرض نہیں کرتا، گوشہ نشینی اس کو محبوب ہوتی ہے، اس کا عمل اکثر اشارۃ النص اور قرآن کی تاویل یا صوفیوں کی اصلاح پر ہوتا ہے، ان اعمال کو قرب ونوافل کہتے ہیں۔

لیکن جس کو اللہ تعالیٰ ولایت انبیاء سے سرفراز کرے، اس کے دل کی جڑ میں اللہ کی محبت اس طرح گڑ جاتی ہے، اور اس طرح راسخ ہو جاتی ہے کہ اس ایثار کا اثر جو "لن تنالوا البر حتى تنفقوا مما تحبون (۳:۹۲) میں بیان کیا گیا ہے اور اللہ کے ان نیک وبرگزیدہ پیغمبروں کی عادت جن کے متعلق "انهم عندنا لمن المصطفين الاخيار "(۳۸:۴۷) میں فرمایا ہے اور جن کی تفصیل "ولكن البر من آمن بالله واليوم الآخر والملئكة والكتاب والنبيين وآتى المال علىٰ حبه ذوى القربىٰ واليتمىٰ والمسكين وابن السبيل ۔ والسائلين وفي الرقاب، واقام الصلوة واتى الزكوة والموفون بعهدهم والصابرين في الباساء والضراء وحين البأس اولئك الذين صدقوا واولئك هم المتقون. (۲:۱۷۷) میں کی گئی ہے۔

یہ ایثار اور پیغمبرانہ اخلاق وعادات اس کی صورت وسیرت میں نمایاں ہو جائیں اور یہ خصائل حمیدہ، نفسانی وجسمانی ظلمتوں اور کدورتوں کو معدوم کر دیں، وہ ہمیشہ خلق خدا کی ہدایت، مجرمین وفساق کو نصیحت، اللہ کے فرائض کو جاری اور قائم کرنے اور انبیاء ومرسلین کی سنتوں کو زندہ کرنے، کفار کے خلاف کوشش، اشرار کی تادیب اور گنہگاروں کی

تعزیر میں مشغول رہے، اکثر مسلمانوں کی مجلسوں اور ان کے مجمعوں میں جا کر ان کو وعظ ونصیحت کرے، اگر چہ اہل مجلس اس کے سننے کی طرف متوجہ نہ ہوں، اس مشرب کو صوفیوں کی اصطلاح میں قرب الفرائض کہتے ہیں، اس مشرب کے لوگوں کا عمل اکثر عبارۃ النص اور تنزیل قرآنی پر ہوتا ہے اس مرتبہ کو ولایت کے تمام مرتبوں سے اعلیٰ یقین کرنا چاہئے.....

ذالك فضل الله يوتيه من يشاء والله ذو الفضل العظيم (۴:۶۲)

سید احمد شہید ریاضت ومجاہدے کرتے رہے اور علوم ظاہری وباطنی کو حاصل کرتے رہے اور اپنے بیشتر اوقات مفسرین، محدثین اور اس خاندان کے علماء وفقہاء کی صحبت میں گذارتے رہے، اس وقت شاہ ولی اللہ کے خاندان کے عظیم فقہاء اور علماء کے سرخیل وسردار جمع تھے، سید صاحب نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور انہوں نے بہت ہی تدبر وتفکر اور فہم کے ساتھ قرآن مجید کا مطالعہ کیا۔

اور تھوڑے ہی عرصے میں سید صاحب سلوک کے بلند مرتبہ پر پہونچ گئے اور انہوں نے بڑی سہولت اور تیزی کے ساتھ سلوک ومعرفت کے دشوار گذار مراحل طے کر لئے انہوں نے اللہ تعالیٰ سے ایسی قربت اور اس کی معرفت حاصل کر لی، جس کی عارفین وعلماء ربانین کی تاریخ میں بہت کم نظیر ملتی ہے۔

سید صاحب دہلی سے اپنے وطن رائے بریلی واپس ہوئے وہاں انہوں نے دوسال گذارے لیکن وطن میں انہیں ٹھہرنا راس نہ آیا، پھر دہلی کا رخ کیا اور وہاں ان کا پرزور استقبال ہوا اور مقبولیت ومرجعیت حاصل ہوئی، اور لوگوں نے بڑی تعداد میں استفادہ وبیعت کے لئے ان سے رابطہ کیا، جب کہ وہ اس کے لئے مکمل طور پر تیار نہ تھے، چونکہ ان کا دل جذبۂ جہاد سے سرشار تھا اس لئے انہوں نے نواب امیر خاں (جو اخیر دور میں ریاست ٹونک کے حکمراں تھے) سے ملاقات کی، نواب صاحب وسطی ہندوستان میں انگریزوں اور بعض راجاؤں سے برسر پیکار رہ چکے تھے، سید صاحب نے انگریزوں کے خلاف جہاد کے سلسلے میں اپنی تیاریوں اور فوج کی تربیت کا ذکر کیا اور چھ سال سے زیادہ عرصہ تک سید

صاحب امیر خاں کی فوج میں رہے وہ فوج کو ٹریننگ دیتے تھے، جہاد وقتال کے لئے ان کی تربیت کرتے تھے اور نازک موقعوں پر نواب صاحب کو مشورہ دیتے تھے، قریب تھا کہ وہ انگریز کو ملک سے نکال پھینکتے اور ان کی حکومت کا خاتمہ کر دیتے لیکن اسی دوران ایک بہت ہی تکلیف دہ بات یہ پیش آئی کہ سید صاحب کی تنبیہ کے باوجود نواب امیر خاں نے انگریز سے مصالحت کر لی، اور آخر کار اس ریاست پر بھی انگریزوں کا تسلط ہو گیا۔

سید صاحب نے اس دوران اپنا پورا وقت فوجی مشقوں اور روحانی وجسمانی مجاہدہ میں صرف کیا، وہ اپنا سارا وقت فوج کی تربیت اور جہاد وقتال کے لئے اس کو منظم کرنے میں صرف کرتے اور اپنی راتوں کو اللہ تعالیٰ کے حضور عبادت وانابت سے زندہ کرتے، یہاں تک کہ ان کے پیروں میں ورم آ جاتا لیکن وہ اس کی بالکل پرواہ نہ کرتے تھے، اور ایک لمحہ کے لئے بھی وہ اپنے مقاصد وعزائم سے پیچھے نہ ہٹے۔ سید صاحب بہت سے شہروں اور قصبات میں ہوتے ہوئے اور وہاں کے لوگوں کے احوال دریافت کرتے ہوئے اپنے وطن واپس آئے، اور جہاں جہاں بھی انہوں نے چند روز قیام کیا وہاں ایک نقش چھوڑ کر آئے، دن بدن آپ کی جانب لوگوں کی توجہ اور رجوع میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

سید صاحب نے لوگوں کو دین کی تعلیمات سے آگاہ کرنے اور انہیں بدعات ورسومات حتیٰ کہ ان کے اندر سرایت کردہ بت پرستی سے متنفر کرنے کے لئے اس موقع کو غنیمت جانا اور اس سے پورا فائدہ اٹھایا اور مختلف علاقوں کے دعوتی وتبلیغی اسفار کئے۔

سید صاحب اس سفر میں سہارنپور، مظفر نگر، دیوبند، نانوتہ، کاندھلہ، رام پور، بریلی، شاہجہانپور اور اس کے علاوہ بعض دیگر مقامات سے گذرے ان علاقوں میں دین کی کھیتی پژمردہ ہو چکی تھی، زمین بنجر ہوتی جا رہی تھی اور سرسبزی کے آثار مفقود ہوتے جا رہے تھے، جب سید صاحب ان علاقوں سے گذرے تو یہ مرجھائی ہوئی کھیتی لہلہا اٹھی اور ایک طویل عرصہ کے بعد یہاں کی سرزمین پھر لالہ زار نظر آنے لگی، جس طرح خشک سالی کے بعد بارش

کے قطرے انسان کے دل کو فرحت و تمکنت بخشتے ہیں بالکل اسی طرح سید صاحب سے مل کر لوگوں کو سرور حاصل ہوا لوگوں نے انہیں گھیر لیا اور ایسے تعلق کا اظہار کیا گویا وہ عرصہ سے سید صاحب کے منتظر تھے، سید صاحب نے ان کے سامنے وعظ وارشاد کیا اور معاشرہ میں پھیلی ہوئی بدعات کو چھوڑنے کی طرف توجہ دلائی، انہوں نے قبر پرستی اور دیگر رائج منکرات کا رد کیا، چنانچہ ان کی اس دعوت کا زبردست اثر پڑا، اور ویران مسجدیں نمازیوں سے آباد و معمور نظر آنے لگیں، اور وہاں کی فضا میں خدا اور رسول کے کلام کی آواز گونجنے لگی، اور چہروں سے نور اور دلوں سے محبت کی بشاشت ظاہر ہونے لگی، ان جانفزا روحانی جھونکوں نے مادی چمک دمک کو پس پشت ڈال دیا اور جس جس گاؤں میں سید صاحب تشریف لے جاتے وہاں روحانی فضا چھا جاتی۔ اور ظاہری طور پر غلہ اور پھلوں و باغات میں بھی سرسبزی وشادابی دکھائی پڑنے لگتی پوری زمین ان کی آمد سے شگفتہ وشاداب نظر آنے لگی۔

اور اللہ تعالیٰ کی رحمتوں و برکتوں کا اس قدر نزول ہوا کہ انسان کی عقل ان کے سامنے حیران وششدر رہ جاتی ہے۔

نزہۃ الخواطر کے مصنف علامہ عبدالحئی حسنیؒ نواح سہارنپور کے ایک بزرگ اور سید صاحب کے مرید شیخ محمد حسین کی زبانی بیان کرتے ہیں:

> ”جہاں جہاں حضرت کے قدم گئے، وہاں وہاں برکت کے آثار پائے جاتے ہیں، ایک جگہ تشریف لے گئے، اس قصبہ میں نومسلموں کا محلّہ پہلے ملتا تھا، انہوں نے حضرت کو روک لیا، قاضی کے محلے تک نہ جانے دیا، اب خدا کی قدرت دیکھئے، نومسلموں کا محلّہ نہایت سرسبز اور وہ لوگ بہت خوش حال اور قاضیوں کا محلّہ ویران پڑا ہوا ہے۔“

وطن واپسی کے بعد سید صاحب نے اپنا سارا وقت مجاہدہ وتربیت اور جسمانی وروحانی مشغولیت اور جنگی فنون کی مہارت وتیاری میں گذارا اور ان تمام مشقوں اور تیاری کے باوجود ان کی عبادت وریاضت روحانی میں کسی قسم کا خلل نہ واقع ہوتا تھا، جہاد کا شوق

بچپن ہی سے ان کے اندر سرایت کئے ہوئے تھا لیکن یہ جذبہ اور شغف اب کہیں زیادہ شدت اختیار کر چکا تھا اور اس کی وجہ سے ان کا اپنے وطن میں قیام ناممکن سا ہوتا جا رہا تھا خاص طور سے جب سے انہوں نے پنجاب کے مسلمانوں پر سکھوں کے ظلم و جور اور ہتک عزت کے واقعات سنے اور جب سے انہیں پتہ چلا کہ سکھ اپنے وطن میں مسلمانوں کو امن وسکون کی زندگی بسر نہیں کرنے دینا چاہتے ہیں تو ان کی تڑپ اور بے کلی بڑھتی گئی۔

اس فکر نے سید صاحب کو بے چین کر دیا اور وہ ان کی زندگی کا ایک جزء لاینفک بن گئی اور ان کی نگاہوں کے سامنے ہر وقت میدان جہاد کا تصور رہنے لگا وہ اس میدان میں زبردست جنگ وجدال کا احساس کرتے اور وہ اس میں بدر وحنین کی جھلک دیکھا کرتے اور سوتے جاگتے بس یہی ایک تڑپ ان کے دل کو بے چین کئے رہتی اور وہ جب بھی کسی توانا وتندرست اور طاقت ور شخص کو دیکھتے تو برملا کہہ اٹھتے کہ ''ہاں! یہ ہمارے کام کا ہے۔''

ایک مرتبہ ایک گاؤں کے چار نوجوان ان سے ملنے کے لئے آئے اور یہ سب کے سب حد درجہ طاقت ور اور بہادر تھے ان کو دیکھتے ہی سید صاحب بے حد خوش ہوئے اور فرمایا کہ مجھے شیوخ اور کبیر السن افراد سے زیادہ ان نوجوانوں کی ضرورت ہے، سید صاحب کی بات نے ان کے دلوں کو متاثر کیا انہوں نے کہا کہ ہم تو حقیر فقیر لوگ ہیں آپ کی اس مدح وستائش کے لائق کہاں؟ سید صاحب نے ان سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کو اپنے کام کے لئے منتخب کیا ہے۔

تاریخ راوی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں قبول کر لیا ان میں سے تین لوگ اکوڑہ کے پہلے معرکے میں شہید ہوئے، اور ان میں سے ایک مستقل سید صاحب کی خدمت میں رہا اور ان کے رفقاء کی رہائش اور ان کے سفر میں مدد کرتا رہا۔

جب فنون حرب کی تربیت اور اس کی مشقوں میں سید صاحب کی مشغولیت بڑھ گئی اور وہ ہمہ وقت اسی میں مصروف رہنے لگے یہاں تک کہ عبادت وسلوک میں بعض

مرتبہ کوتاہی واقع ہونے لگی تو لوگوں میں اس سلسلہ میں چہ می گوئیاں بڑھ گئیں اور وہ اس کا تذکرہ کرنے لگے اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ کوئی ایک فرد اس بات کو سید صاحب سے بیان کرے اور ان کے سامنے صورت حال کو واضح کرے، جب سید صاحب نے لوگوں کی باتیں سنیں تو فرمایا:

''ان دنوں اس سے افضل کام ہم کو درپیش ہے اس میں ہمارا دل مشغول ہے، وہ جہاد فی سبیل اللہ کی تیاری ہے، اس کے سامنے اس حال کی کچھ حقیقت نہیں وہ کام یعنی تحصیل علم سلوک اس کام کے تابع ہے اگر کوئی تمام دن روزے رکھے، تمام رات عبادت ریاضت میں گذارے، اور نوافل پڑھتے پڑھتے پیروں میں ورم آجائے اور دوسرا شخص جہاد کی نیت سے ایک گھڑی بھی بارود اڑائے تاکہ کفار کے مقابلہ میں بندوق لگائے آنکھ نہ جھپکے تو وہ عابد اس مجاہد کے رتبہ کو ہرگز نہیں پہونچ سکتا اور وہ کام (سلوک وتصوف) جو پندرہ سولہ روز سے نماز یا مراقبے میں دوسرے انوار کی ترقی معلوم ہوتی ہے وہ اسی کاروبار کے طفیل سے ہے۔''

سید صاحب کی بات نے لوگوں کے دلوں پر گہرا اثر چھوڑا، اور انہوں نے سید صاحب کی خواہش کے مطابق کام کرنے اور ان کے احکام کی اتباع کرنے میں ہی سراسر خیر سمجھا اس سے ان کے دلوں کو سکون اور قلب کو راحت ملی اور انہوں نے اس کو اسی طرح سمجھ لیا کہ دین اسلام کی اشاعت کے لئے دشمنوں سے جنگ اور جہاد وقت کی اہم ترین ضرورت اور پکار ہے، سید صاحب نے بھی حکومت سے سمجھ لیا کہ اب جہاد کے لئے راستہ ہموار ہو چکا ہے اور مجاہدین راہ خدا میں قربانی دینے کے لئے تیار ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ وہ معرکہ بپا کرنے سے قبل زیارت حرمین شریفین سے بہرہ ور ہوں، حج کریں اور حرمین شریفین کی برکتوں سے نئی طاقت وقوت اور نشاط حاصل کرلیں، اور بیت اللہ میں وہ اللہ تعالیٰ سے کامرانی وتوفیق کی دعا کریں، یہ فکر ان کے ذہن ودماغ پر چھا گئی اور وہ اس کے لئے بے چین ہوگئے اور سمجھ گئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے اور وہ اپنے گھر بلانا چاہتا ہے اس لئے اس دعوت پر لبیک کہنا ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے دور میں سید صاحب کے دل میں حج وزیارت کی بات ڈالی جس وقت لوگ حج وزیارت کو ذہنوں سے اوجھل کر چکے تھے، بعض علماء نے سفر کی دشواریوں کے پیش نظر حج کے ساقط ہونے کا فتویٰ دیدیا تھا، اس زمانے میں سفر حج آسان بھی نہ تھا، اس لئے کہ راستہ کے خطرات اس راہ میں حائل ہوجایا کرتے تھے، راستے غیر مامون تھے اور آج کی طرح جہاز اور کشتیاں بھی اس دور میں میسر نہ تھیں، طرح طرح کے مصائب اور مشقتیں سفر میں درپیش ہوتی ہیں جن کا ہم تصور بھی نہیں کرسکتے یہی ساری چیزیں ہر ہر قدم پر ان کی اس مبارک آرزو کی تکمیل میں حائل ہوجایا کرتی ہیں۔

لیکن حج وزیارت اور روضہ اقدس کے شوق نے سید صاحب کو دیوانہ بنادیا تھا، انہوں نے اپنے اس سفر کا اعلان کردیا اور لوگوں سے کہا کہ جوان کی رفاقت میں سفر حج کرنا چاہے تو اس کو اجازت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ موقع عنایت فرمایا جو جہاد کے لئے پہلا قدم اور میدان جنگ میں دشواریوں اور مشکلات کو جھیلنے کی ایک اولین تربیت گاہ ثابت ہوا، اس لئے کہ یہ سفر جہاد بالنفس اور مستقبل میں پیش آنے والے مسائل کے لئے ایک طرح سے پیش خیمہ اور تمہید ثابت ہوا۔

پورے ملک میں بڑی تیزی سے حج کی خبر عام ہوگئی، اور چند ہی روز کے اندر حج کرنے والوں کے وفود آنے لگے اور ہر جگہ سے حج کے وقت اور رفاقت کی اجازت پر مشتمل خطوط سید صاحب کے پاس پہونچنے لگے، اس طرح اس سفر میمون میں سید صاحب کی رفاقت میں جانے والوں کی ایک بھیڑ جمع ہونے لگی، لوگوں کی آرزوئیں برآئیں اور عشق وشوق کا شعلہ ان کے دلوں میں موجزن ہونے لگا اور اپنے دیار میں ایک لمحہ کے لئے بھی ٹھہرنا لوگوں پر گراں گزرنے لگا، ہر ایک بس اسی سفر کے لئے رخت سفر باندھے اپنے کو خوش نصیب تصور کررہا تھا اور سید صاحب کی اس معیت پر نازاں وفرحاں تھا، اوائل شوال ۱۲۳۸ھ میں سید صاحب نے عید کی دوگانہ ادا کرنے کے بعد اپنے اس مبارک سفر کے آغاز کا اعلان کیا، آپ کے ساتھ چار سو افراد اپنے اصل وطن تکیہ رائے بریلی کو چھوڑ کر مکہ ومدینہ

کے لئے نکلے ان کے اندر اللہ تعالیٰ سے طاقت وقوت اور نشاط وکیفیت کی طلب تھی، اور وہ اپنے نفس کو حد درجہ نشاط اور پختہ ایمان کے ساتھ غذا پہونچانے کے متمنی تھے۔

لیکن کیا سید صاحب ہندوستان سے سیدھے حجاز پہونچ گئے، جیسا کہ آج کل ہوتا ہے؟ یا ان کے راستے میں رکاوٹیں پیش آئیں اور کیا وہاں تک پہونچنے میں ایک عرصہ نہیں لگا؟ اس مبارک سفر کے سلسلہ میں معلومات حاصل کرنا اس لئے ضروری ہے کہ در حقیقت اشاعت اسلام کے راستہ میں کئے گئے اسفار میں یہ بہت اہم سفر شمار کیا جاتا ہے، اور اس کو ہر زمانے وعلاقے میں زندہ وپائندہ رکھنا ضروری ہے، تاکہ یہ سفر حاجیوں کے لئے ایک بہترین نمونہ اور ہر جگہ کے مسلمانوں کے لئے ایک مثال اور آئیڈیل ثابت ہو۔

سید صاحب اپنے گاؤں سے ڈلمئو پہونچے جو گنگا کے قریب ہے اور سید صاحب کے گاؤں سے تقریباً ۱۸ میل کے فاصلہ پر ہے، آگے کشتی کے ذریعہ سفر کا ارادہ تھا ڈلمئو پہونچے، تو ایک جماعت کو پہلے سے منتظر پایا، تبلیغ کا موقع ہاتھ آ گیا، اور اپنی جماعت کے ساتھ وہاں دعوت وتبلیغ کرتے ہوئے اور غلط رسم ورواج کا خاتمہ کرتے ہوئے کچھ دن قیام فرمایا۔ لوگوں کے دل پر آپ کی بات کا گہرا اثر ہوا۔ اس کے نتیجہ میں بے شمار مرد عورتیں نئے سرے سے اسلام میں داخل ہوئیں۔ اس گاؤں میں انہوں نے اپنے ایک وعظ میں فرمایا:

''برادران اسلام! مجھ کو عنایت الٰہی سے قوی امید ہے کہ اس سفر میں اللہ تعالیٰ میرے ہاتھوں سے لاکھوں آدمیوں کو ہدایت نصیب کرے گا اور ہزاروں ایسے لوگ جو دریائے شرک وبدعت اور فسق وفجور میں ڈوبے ہوئے ہیں اور شعائر اسلام سے مطلق ناواقف ہیں وہ پکے موحد اور متقی ہوں گے۔''

جناب الٰہی میں، میں نے اہل ہند کے لئے بہت دعا کی کہ الٰہی ہندوستان سے تیرے کعبہ کی راہ مسدود ہے، ہزاروں صاحب ثروت جنہیں حج کی توفیق نہ ہوسکی کیونکہ نفس وشیطان نے انہیں بہکا دیا کہ راستے میں امن نہیں ہے، حج سے محروم رہے، اور ہزاروں صاحب ثروت اسی وسوسہ سے نہیں جاتے سو اپنی رحمت سے ایسا راستہ

کھول دے کہ جو ارادہ کرے بے خطر چلا جائے اور اس نعمت عظمیٰ سے محروم نہ رہے۔
میری یہ دعا اس ذات پاک نے مستجاب کی اور اس کا وعدہ پورا ہو کر رہا،
اس وقت سے اب تک حج کا راستہ پر امن ہے اور دن بدن سہولت و آسانی میں اضافہ ہی
ہوتا جا رہا ہے۔"

سید صاحب مستقل ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں اور ایک شہر سے دوسرے شہر منتقل ہوتے رہے اور بلاد مقدسہ کے اس سفر میں وہ چلتے پھرتے اور رکتے رکاتے جہاں بھی پہونچتے لوگوں کو اسلام کا پیغام سناتے اور انہیں دین اسلام اور سنت رسول اللہ سے آگاہ کرتے، ان کے رفقاء خاص مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ اور مولانا عبدالحیؒ بھی ان کے اس مشن میں ان کے قدم سے قدم ملائے ہوئے تھے۔ بعض شہروں میں دو ہفتے کے قریب قیام ہوا اور انہوں نے تبلیغ و اشاعت دین کے اس سنہرے موقع کو لمحہ بھر کے لئے ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

یہ ائمہ و داعیان اسلام الٰہ آباد، بنارس، عظیم آباد، بھاگلپور اور مرشد آباد ہوتے ہوئے کلکتہ پہونچے اور ہر قیام گاہ و اسٹیشن پر یہ لوگ دین اسلام کی اشاعت کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ اور لوگوں کو دین کی باتیں سکھاتے رہے۔

سید صاحب اپنی جماعت کے ساتھ تین ماہ کلکتہ میں قیام پذیر رہے، اس مختصر عرصہ میں اللہ تعالیٰ نے ان سے ایسے ایسے جلیل القدر کام لئے جن کے لئے ایک طویل مدت درکار ہوتی ہے اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ ایک بڑی تعداد کو دین اسلام کی ہدایت نصیب کی، اور ہزار ہا لوگوں کو شرک و بت پرستی اور بدعات و ضلالت سے نکال کر توحید خالص اور ایمان راسخ عطا کیا، بے شمار لوگوں نے منکرات و محرمات یعنی شراب و قمار سے توبہ کی، کتنوں نے مے خانے بند کر دئے اور سونے و چاندی کے برتنوں کو توڑ ڈالا، اور انہوں نے اسلامی تعلیمات کے خلاف ہو رہے ہر عمل کو ختم کئے جانے کا حکومت سے مطالبہ کیا اور احتجاج کے طور پر بہت سے مسلمانوں نے اہم سے اہم سرکاری عہدوں سے دستبرداری کا مظاہرہ کیا۔

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ روزانہ تقریباً ایک ہزار افراد توبہ کرتے اور سید

صاحب کے ہاتھ پر بیعت ہوتے تھے اور اس کے ساتھ تقریباً دس سے پندرہ نفوس یومیہ اسلام قبول کرتے تھے۔ سید صاحب اور ان کے دونوں رفیق مولانا محمد اسماعیل شہید اور مولانا عبدالحی بڑھانوی مسلسل تبلیغ دین میں سرگرداں رہتے اور دعوت اسلام کے لئے وہ اس موقع کو غنیمت جانتے تھے، حال یہ تھا کہ ان امور میں وہ اس حد تک مصروف رہتے کہ آرام وراحت کے لئے انہیں ذرا بھی موقع نہ مل پاتا تھا۔

یہ واقعہ بھی حیرت انگیز ہے کہ اس عرصہ میں شراب خانے بند رہے یہاں تک کہ شراب خانوں کے مالک وہاں کے حکام سے یہ شکایت کرنے پر مجبور ہو گئے کہ: اس شخص نے جب سے اس شہر میں قدم رکھا ہے ایک فرد بھی شراب خانے نہیں آتا، نہ کوئی شراب خریدنے والا بچا ہے اور نہ پینے والا، اس صورت حال نے ہمارے کاروبار کو بہت بڑے نقصان سے دو چار کر دیا ہے، حکام نے انہیں اطمینان دلایا اور ان سے کہا: کہ یہ لوگ اس شہر سے جلد ہی دوسرے شہر چلے جائیں گے، ہم اس کے بعد تمہارے خسارے کے سلسلہ میں تفتیش کریں گے اور اگر تمہارا خسارہ ثابت ہو گیا تو ہم تم لوگوں کے ٹیکس میں تخفیف کر دیں گے۔

سید صاحب اور ان کی جماعت کا قیام کلکتہ میں تین ماہ رہا اور اس پورے عرصہ میں کسی کی پروا کئے بغیر وہ دعوت وارشاد کے عمل کو انجام دیتے رہے، لوگوں کے دلوں پر ان کی حکمرانی تھی، اور اس طرح انگریزوں کی، مادی حکومت کے مقابلہ میں ان کی یہ بالا دستی اور حکمرانی طاقت ور اور زوردار تھی چنانچہ دلوں کی اس فاتح جماعت پر لوگ ٹوٹ پڑے اور ان کی اس مقبولیت اور شہرت نے لوگوں کو مجبور کر دیا کہ وہ سید صاحب کے دین اسلام کی خدمت اور لوگوں کے تزکیہ کے سلسلہ میں ان کی تڑپ کے طاقت ور محرک اور جذبات واحساسات کے بارے میں غور وفکر کریں۔

سید صاحب کی وہ آرزو مکمل ہوئی جس کو انہوں نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا تھا:

''مجھ کو عنایت الٰہی سے قوی امید ہے کہ اس سفر میں اللہ تعالیٰ میرے ہاتھ لاکھوں آدمیوں کو ہدایت نصیب کرے گا اور ہزاروں ایسے لوگ جو دریائے شرک

وبدعت وفسق وفجور میں ڈوبے ہوئے ہیں اور شعائر اسلام سے مطلق ناواقف ہیں وہ پکے موحد اور متقی ہوں گے۔"

سید صاحب کلکتہ سے سمندری راستہ سے حجاز روانہ ہوئے اور ساحل سمندر پر انہیں بے شمار افراد نے الوداع کہا اور وہ اپنے پیچھے لوگوں کے دلوں میں دعوت واصلاح کا ایک گہرا نقش اور تأثر چھوڑ گئے اور ان کے ہاتھ پر بے شمار برکات وکرامات اور روحانی فیوض ظاہر ہوئے جسے ان کے ہم سفر اور قربت رکھنے والوں کے سوا کسی کے لئے محسوس کر پانا مشکل ہے۔

سید صاحب اپنے اس سفر میں بہت سے مقامات پر ٹھہرے اور ہر جگہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو انجام دیتے رہے ان کا گزر "مینانی" سے ہوا تو انہوں نے بہت سے مردوں اور عورتوں کو برہنہ غسل کرتے ہوئے دیکھا جو بغیر کسی شرم ولحاظ کے ایسا کرتے تھے اور یہ عادت ان میں نسل در نسل چلی آرہی تھی، سید صاحب نے اس عادت کو سخت ناپسند کیا اور شہر کے جج اور حاکم سے اس موضوع پر بات کرنے کے لئے ملاقات کی اور انہیں اس برے کام کے سخت اور دردناک انجام سے ڈرایا، انہوں نے سید صاحب سے معذرت کی اور کہا کہ اس شہر کے لوگوں نے غسل کے اس طریقہ کی عادت بنالی ہے وہ اسے برا نہیں سمجھتے لیکن ہم ایسے احکام صادر کردیں گے کہ جب تک آپ کا اس شہر میں قیام ہے وہ ایسا عمل کرنے سے باز رہیں، سید صاحب اس شہر میں ایک ماہ رہے اور یہ بری عادت خود بخود ختم ہوگئی اور سید صاحب کے وہاں سے چلے جانے کے بعد بھی لوگوں نے دوبارہ اس عمل کو انجام نہیں دیا۔

سید صاحب اور ان کی جماعت جدہ کی بندرگاہ پر شعبان ۱۲۳۷ھ کو پہونچی اور ۲۸ رشعبان کو حرم مقدس میں داخلہ کی سعادت نصیب ہوئی، جب ان لوگوں کی بیت اللہ پر پہلی نظر پڑی تو اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے اور اس سعادت کے حصول پر جس کے برابر کوئی سعادت نہیں ہوسکتی، خوشی سے رو پڑے، اور انہوں نے اس نعمت پر باری تعالیٰ کا

شکریہ ادا کیا، طواف کیا، سعی کی، اور احرام سے نکلے، ایک دوسرے کو مبارک باد دی، طواف کرنے والے جملہ افراد اور خدام اس قافلے کے اندر برکت اور قبولیت کی علامت دیکھ کر تعجب میں پڑ گئے، یہاں تک کہ انہوں نے کہا کہ ہم نے اپنی پوری زندگی میں اس جیسی مبارک جماعت آج تک نہ دیکھی۔

سید صاحب نے رمضان المبارک کا چاند دیکھا تو خوشی و مسرت سے پھولے نہ سمائے اور اس شہر مقدس میں عبادت و انابت، ذکر و تلاوت اور اعتکاف کے ساتھ انہوں نے اس مبارک مہینہ کو گذارا اور جب حج کا موقعہ آیا تو انہوں نے حج مبرور کیا۔

سید صاحب نے وہاں بھی محض ارکان حج کی ادائیگی پر بس نہیں کیا بلکہ وہ سرزمین حجاز میں بھی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے رہے، اور باشندگان حجاز کے دلوں کو بھی اس ایمان سے روشن و منور کرتے رہے جس کے وہ اصل حامل ہیں اور اخلاق و ایمان پر بیعت کی غرض سے سید صاحب نے اکابر علماء حجاز سے ملاقاتیں کیں، ان میں مکہ مکرمہ کے مفتی شیخ محمد عمر اور سید عقیل، سید حمزہ، اور مصلیٰ حنفی کے امام شیخ مصطفےٰ، بیت اللہ کے واعظ و خطیب شیخ شمس الدین مصری اور مکہ مکرمہ میں مدرس شیخ محمد علی ہندی کے علاوہ شیخ عمر بن عبدالرسول محدث، شیخ بخاری مدرس مدینہ منورہ، خواجہ الماس وغیرہم سے ملاقاتیں کیں، ان کا شمار مسجد نبوی کے اولیاء اللہ میں ہوتا ہے۔

پورے عالم اسلام نے سید صاحب کے اس چشمۂ فیض سے سیرابی حاصل کی، اور ان کی برکات محض حجاز مقدس کی چہار دیواری تک محدود نہ رہ سکیں بلکہ حجاز کے تمام عالم اسلام کے مرکز ہونے اور خاص طور سے موسم حج میں وہاں کے نو واردین کی وجہ سے سید صاحب کی یہ دعوت و فکر پورے عالم اسلام میں پھیل گئی۔

مدینہ منورہ اور روضۂ اقدس کی زیارت کے بعد سید صاحب نے اپنے تمام اوقات کو مسجد رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں صرف کیا، اس سے ایمان و یقین میں تازگی کی ایک لہر دوڑ گئی اور اسے ایک نئی طاقت و قوت عطا ہوئی، اس کے بعد سید صاحب نے خدا تعالیٰ سے وطن

واپسی کی اجازت طلب کی تا کہ وہ اپنے دل کی اس چبھن اور فکر کے مطابق اپنے عزائم کو بروئے کار لاسکیں، ۲۰ ربیع الاول ۱۸۳۸ء کو سید صاحب نے مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ کا سفر کیا، رمضان کا مہینہ گزار کر ذیقعدہ میں وہاں سے رخصت ہو گئے اور ۲۹ شعبان ۱۲۳۹ھ کو دو سال گیارہ ماہ کے وقفہ کے بعد اپنے وطن واپس پہونچے۔

اب وہ گھڑی آن پہونچی تھی کہ سید صاحب جہاد کے سلسلہ میں اپنے ان عزائم وآرزوؤں کو شرمندۂ وفا کرتے جو بچپن سے ان کی عادت بن چکے تھے، اور مسلمانوں کو ظالم وخونخوار بھیڑیوں کے چنگل سے آزاد کرا کے، انہیں غیر انسانی قانون سے نکال کر شریعت اسلامیہ کے عدل ومساوات اور اس کی روشنی وتابانی عطا کرتے، سید صاحب اپنے فراست ایمانی سے اس نتیجہ پر پہونچے کہ عمومی طور پر مسلمانوں کی زبوں حالی خصوصاً پنجاب کے مسلمانوں کی بدحالی کا صرف ایک ہی حل ہے وہ یہ کہ جب تک ایک مستقل فرض شناس اسلامی ریاست کا قیام نہیں ہوتا ظلمت کا یہ بادل چھٹنے والا نہیں، انہوں نے دیکھا کہ ملک کے اندر اسلام اس وقت ضعف واضمحلال کا شکار ہے اور مسلمانوں کے اندر سے کوئی بھی غیرت مند اور ایمان ویقین کا حامل اس کے مقابلہ کے لئے کمر بستہ نہیں ہوتا اسی لئے ہندوستان میں اسلام کا عہد تمام ہوا اور پھر اس جاہلیت کا دور دورہ ہو گیا اور دوبارہ کفر وفسق کی فضا پورے ملک کے اوپر چھا گئی اور ملک شرک کی گود میں پہونچ گیا اور مختلف معبودان باطل کی پوجا اور کفر وشرک کی تاریکی بھی دور جہالت کی طرح پھیلنے لگی۔

سید صاحب نے اپنی نگاہوں سے دیکھا کہ شرک وجہالت کی موجیں ملت اسلامیہ ہند اور پورے عالم اسلام کے مسلمانوں کو بہالے جانا چاہتی ہیں اور انہوں نے مسلمانوں کے دل ودماغ پر مسلط ہو رہی بدعات وخرافات کو بھی قریب سے دیکھا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ اسلام اور علماء کے درمیان مستقل طور پر دوری بڑھتی جارہی ہے، اور ان کے مابین خلیج دن بدن وسیع تر ہوتی جارہی ہے، اور ایمان وزندگی اور علم وعمل کی دوری میں اضافہ ہوتا جارہا ہے اور انہوں نے بہ نفس نفیس یہ مشاہدہ کیا کہ دین اسلام کی حرمت پامال کی جارہی ہے اور

اسلامی شعائر کی ہتک کی جارہی ہے۔ اور اسلامی ملکوں اور اسلام کے قلعوں کے اندر زوال وانحطاط نے سرایت کرنا شروع کردیا ہے، سید صاحب نے ان تمام امور کا بغور معائنہ ومشاہدہ کیا، اور انہوں نے اس بات کو پوری طرح سمجھ لیا کہ اس مرض کا علاج صرف وعظ وارشاد میں نہیں ہے۔ اور صورت حال اتنی بگڑ چکی ہے کہ درس کی مجلسیں اور صرف تزکیۂ باطن حالات کے رخ کو موڑنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ ان کو یہ کامل اعتقاد اور پختہ یقین ہو چکا تھا کہ اسلام اور مسلمانوں کو صرف اور صرف طاقت کی ضرورت ہے۔ وہ طاقت وقوت جو پختہ ایمان اور ٹھوس عزائم کے سرچشمہ سے تقویت پاتی ہے تاکہ اس طاقت کے ذریعہ زمانے کے ظالم دھاروں اور اس کے سیل بلاخیز کو روکا جاسکے۔

ان کا یقین تھا کہ اسلامی شریعت اپنے تمام حدود وتعزیرات اور قوانین کے ساتھ عملی زندگی میں اسلامی حکومت کے بغیر نافذ نہیں ہوسکتی۔ اور اب مسلمان اسلامی نظام کے بغیر نہ تو اپنے ضعف وانحطاط سے نکل سکتے ہیں اور نہ ہی وہ اسلامی نظام کی بالادستی کو ثابت کرسکتے ہیں، اور طاقت وغلبہ اور حکومت کے بغیر وہ سرے سے باطل نظاموں پر اسلام کی برتری کو بھی ثابت نہیں کرسکتے۔ اس طریق کار سے ان شاء اللہ جلد ہی اسلام غالب آجائے گا اور ہر جگہ وہ اپنا اثر ونفوذ قائم کردے گا اور لوگ اسلام اور اس کی تمام تعلیمات پر عمل کرنے پر قادر ہوسکیں گے اس لئے کہ کتاب وسنت کے ایک بہت بڑے حصہ پر عمل ایسی اسلامی حکومت کے بغیر ناممکن ہے جس کی اساس شریعت اسلامی اور دین حنیف پر ہو۔ اس سلسلہ میں سید صاحب کے ایک خطاب سے ان کے افکار وخیالات کی ترجمانی ہوتی ہے:

> ''دین کی بقاء حکومت میں ہے اور وہ دینی احکام وقوانین جن کا حکومت سے تعلق ہے ان پر اسلامی حکومت کے بغیر عمل ممکن نہیں ہے، اور جب اسلامی حکومت قائم ہوجائے گی تو مسلمان اس ملک میں کفار کے ہاتھوں ذلت ونکبت سے دوچار نہ ہوں گے، اور اسلامی شعائر کی پامالی نہ ہوگی، اور مسجدوں کا انہدام اور ان کی تخریب کاری کا سلسلہ بند ہوجائے گا اور جب تک اس دیار میں ایک مستقل اسلامی حکومت نہیں

ہوجاتی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔"

گذشتہ صفحات سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ سید صاحب ہمہ وقت جہاد کے لئے تیار رہتے تھے وہ لوگوں کے اندر دینی بیداری کی روح اور دشمنان اسلام سے قتال کا جذبہ پیدا کرتے تھے وہ ایک اسلامی حکومت کے قیام کے لئے بہت زیادہ فکرمند رہا کرتے تھے، تاکہ اسلام کا کلمہ اور دین کا علم بلند ہو، اور مسلمانوں کی عظمت رفتہ ان کا تشخص اور خود اعتمادی بحال ہو، اور جب سید صاحب نے دیکھا کہ سکھ مسلمانوں کو غلام بناتے ہیں اور ان پر ظلم وشقاوت کے پہاڑ توڑتے ہیں اور دلوں کو جھنجھوڑنے اور جگر کے ٹکڑے ٹکڑے کردینے والی تکلیفیں پہونچاتے ہیں تو انہوں نے بغیر کسی اور موقع کا انتظار کئے خدا کے راستہ میں جہاد کا عزم کیا، اور مندرجہ ذیل وجوہات کی بنا پر انہوں نے پنجاب کو جہاد کا مرکز قرار دیا:

۱- اس وقت پنجاب کے مسلمانوں کی مدد کرنا تمام مسلمانوں کا ایک شرعی فریضہ تھا اور اس سے پہلوتہی ان کے جان ومال کے لئے بہت بڑا خطرہ بن سکتی تھی۔

۲- دینی شعائر اور اسلامی تقدس کی پامالی۔

۳- وہاں آزاد جنگجو قبائل کا وجود۔

۴- وہاں سے مستقل آزاد اسلامی ملکوں اور جماعتوں کا قرب۔

سید احمد شہید کا اس جہاد سے، اس ملک کے اندر دین اسلام کی بنیادوں کو تقویت پہنچانے اور اس کے ستونوں کو مضبوط کرنے کے علاوہ اور کوئی مطلوب ومقصود نہ تھا، وہ چاہتے تھے کہ وہ وہاں کے مسلمانوں کی زندگی روشن وتابناک دیکھیں اور انہیں اسلامی زندگی کی بہتری سے قرار نصیب ہو، اور مسلمانوں کی عظمت رفتہ، اور دین کی سطوت وشوکت دوبارہ واپس آجائے، اور جن باطل طاقتوں نے اسلام اور مسلمانوں کا عرصہ حیات تنگ کررکھا ہے وہ پامال ہوجائیں، انہوں نے عزم کیا کہ وہ مادی طاقتوں کا کام تمام کریں گے اور کفر وفسق اور نفاق کے مراکز پر حملہ کریں گے اور ان کو اس قدر کمزور کردیں گے کہ ان کے اندر دوبارہ اٹھنے کی سکت باقی نہ رہے اور ان سب کا خاتمہ سید صاحب کے ذریعہ ہو، تاکہ وہ اپنی نگاہوں

سے اس ملک کے اندر اسلام کے غلبہ وکامرانی اور کفر کی مغلوبیت وشکست خوردگی کا مشاہدہ کریں۔

سید صاحب کے جہاد کا واحد مقصد دین اسلام کا غلبہ، اور اعلاء کلمۃ اللہ، اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی اشاعت تھا، انہوں نے اپنے اس مقصد کو اپنے ان بعض مکتوبات میں واضح کیا ہے جنہیں پنجاب کے علاقوں میں انہوں نے بھیجا تھا:

''اہل انصاف وعدالت سے پوشیدہ نہیں ہے، کہ اہل کفر وضلال کے ساتھ جو جنگ وجدال اور قتال ہوتا ہے، اگر محض مال وعزت اور حکومت وریاست حاصل کرنے کے لئے ہو تو اللہ تعالیٰ کے وہاں اس کا کچھ اعتبار نہیں اور اگر نصرت دین اور اعلاء کلمۃ اللہ اور ترویج سنت نبوی کے لئے ہو تو اس کو عرف شرع میں جہاد کہتے ہیں اور وہ تمام عبادات میں افضل اور تمام طاعات سے اکمل ہے کہ کوئی عبادت ارفع درجات اور تکوینات اس کے مساوی نہیں جیسا کہ آیت کریمہ ''وفضل اللہ المجاھدین علی القاعدین اجرا عظیما' درجات منه ومغفرة ورحمة (۴:۹۰،۹۶) سے معلوم ہوتا ہے، بس اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ فرض قانون شریعت کے مطابق ادا کیا جائے تا کہ آخرت میں وسیلۂ نجات اور دنیا میں ثمرات اور نزول رحمت یزدانی اور تائید آسمانی کا باعث ہو۔''

یہ ایک دوسرا خط ہے جس میں ہندوستان کے علماء وشیوخ اور امراء کو مخاطب کیا ہے اس خط میں سید صاحب اپنے جہاد کے سلسلہ میں اپنے نقطۂ نظر اور مقصد کو واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے اس عاجز کو یہ توفیق بخشی کہ وہ لوگوں کو اتباع شریعت اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی دعوت دے، اور یہ اس کا رات دن کا مشغلہ ہو گیا جیسا کہ ہمارے ساتھیوں کو علم ہے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ہم پر یہ احسان کیا کہ ہم کو کچھ مومن بندوں کے ساتھ مہاجرین کے زمرہ میں شامل کیا، میں اللہ تعالیٰ کی عنایت کردہ اس نعمت کا حد درجہ شکر گزار ہوں، کہ اس نے اسلام اور امر بالمعروف کی دعوت کی توفیق بخشی، اور

یہ دونوں چیزیں جہاد وقتال کے بغیر کامل نہیں ہوسکتی ہیں، اللہ تعالیٰ نے تمام ہادیوں کے امام اور داعیوں کے سردار محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو آخر میں کفار سے قتال کا حکم دیا چنانچہ اس طرح تمام مذاہب وادیان پر اللہ تعالیٰ کا دین اور اس کی شریعت کا غلبہ ہوا اس بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس عبادت کی ادائیگی کی توفیق بخشی، اس طرح کہ میں نے اس عظیم کام کے بروئے کار لانے کا عزم کیا، اور اسکے راستہ اور سعادت کے حصول میں میں نے وطن، اہل وعیال اور جان ومال ہر چیز کو فنا کردینے کا تہیہ کیا، یہ سارا عمل خدا کی خوشنودی کے حصول اور کفار ومشرکین کی مخالفت کی نیت سے کیا، اس میں کہیں بھی ہوائے نفسانی اور شیطان کے وساوس کا کوئی دخل نہیں، اور میں ایک بار پھر اس کی صراحت کرتا ہوں کہ میں خدائے علام الغیوب کو گواہ بناتا ہوں کہ میرے دل کے اندر کفار اور مشرکین کے ساتھ جو جہاد کا جذبہ موجزن ہے اس میں رضائے الٰہی اور اعلاء کلمۃ اللہ کے مقصد کے سوا اور جاہ ومنصب، سیادت وحکومت، مال ودولت، شہرت وناموری، امارت وسلطنت، برادران ومعاصرین پر فضیلت وبرتری یا کسی اور چیز کا فاسد خیال تک ہرگز دل میں نہیں ہے، اور ہم جو بات کہہ رہے ہیں اللہ تعالیٰ اس کا گواہ ہے''۔

ایک دوسرے خط میں تحریر فرماتے ہیں:

''ہم محض رضائے الٰہی کے آرزومند ہیں ہم ان آنکھوں اور کانوں کو غیر اللہ کی طرف سے بند کر چکے ہیں اور دنیا ومافیہا سے ہاتھ اٹھا چکے ہیں، ہم نے محض اللہ کے لئے علم جہاد بلند کیا، ہم مال ومنال، جاہ وجلال، امارت وریاست، حکومت وسیادت کی طلب وآرزو سے آگے نکل گئے ہیں، خدا کے سوا ہمارا کوئی مطلوب نہیں ہے اگرچہ ہم عاجز وخاکسار، ذرہ بے مقدار ہیں لیکن بلاشک محبت الٰہی سے سرشار اور غیر خدا کی محبت سے بالکل دستبردار ہیں، ہم مسلمان امراء وروساء سے ہرگز جنگ کرنا نہیں چاہتے۔''

جہاد کے مقصد اور اپنی نیت کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''خدائے علام الغیوب گواہ ہے کہ کبھی بھی میرے دل میں یہ خیال نہ آیا کہ میں سونے چاندی کے کسی ذرہ کا مالک بنوں، اور کسی ملک پر حکومت کروں، میرا

ایک زبردست عہدہ ہو میں لوگوں کو حکم دوں ان کو روکوں یا صاحب اقتدار لوگوں کی تذلیل کروں یا اپنے ہمسروں پر احکام کا اجرا یا ہم عصروں پر فوقیت و امتیاز جتاؤں، ایسی بات نہ کبھی زبان پر آئی ہے نہ کبھی خیال میں گزری ہے۔

تاج و تخت سکندری کی قیمت میرے نزدیک ایک جو کے برابر بھی نہیں، کسری و قیصر کی سلطنت میں خاطر میں بھی نہیں لاتا، ہاں اس قدر آرزو رکھتا ہوں کہ اکثر افراد انسانی بلکہ تمام ممالک عالم میں رب العالمین کے احکام جن کا نام شرع متین ہے، کسی کی مخالفت کے بغیر جاری ہو جائیں، خواہ میرے ہاتھ سے، خواہ کسی دوسرے کے ہاتھ سے، پس ہر ترکیب و تدبیر جو اس مقصد کے حصول کے لئے مفید ہوگی عمل میں لاؤں گا۔"

وہ اس زمانہ میں ہندوستان کے اندر کے حالات کے سلسلہ میں گفتگو کرتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ رنج و الم میں ڈوبے ہوئے ہیں انہوں نے بعض اعیان سلطنت کو مخاطب کرتے ہوئے ایک خط میں لکھا:

"تقدیر سے چند سال سے ہندوستان کی حکومت و سلطنت کا یہ حال ہو گیا ہے کہ عیسائیوں اور مشرکین نے ہندوستان کے اکثر حصے پر غلبہ حاصل کر لیا ہے اور ظلم و استبداد شروع کر دیا ہے، کفر و شرک کے رسوم کا غلبہ ہو گیا ہے اور شعائر اسلام اٹھ گئے ہیں، یہ حال دیکھ کر ہم لوگوں کو بڑا صدمہ ہوا، ہجرت کا شوق دامن گیر ہوا، دل میں غیرت ایمان اور سر میں جہاد کا جوش و خروش ہے۔"

یہ افکار و خیالات سید صاحب کے عزائم پر روشنی ڈالنے کے لئے کافی ہیں اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ سید صاحب کے دل میں آخر جہاد کا شعلہ کیوں بھڑک رہا تھا اور انہوں نے ملک کے طول و عرض میں علم جہاد کیوں بلند کیا، اگر ہم ان پر ذرا سا بھی غور کریں تو یہ بات آشکارا ہو جاتی ہے کہ سید صاحب کی قائم کردہ تحریک جہاد صحیح اسلامی حکومت کے قیام کی جانب پہلا قدم تھا اور یہ اس زمانے میں امت اسلامیہ کی اولین ضرورت تھی اور اگر تقدیر اس میں کامیابی لکھ دیتی تو آج عالم اسلام کا نقشہ ہی بدلا ہوا ہوتا اور وہ ایک زبردست طاقت بن کر ابھرتا، اور سارے مسلمان ایک طاقت ور خاندان کی طرح ہوتے ان کے سامنے کوئی

بڑی طاقت اور حکومت مقابلہ کے لئے نہ کھڑی ہوتی۔

اس سے پہلے ہم نے یہ تذکرہ کیا تھا کہ سید صاحب سفر حج سے قبل اپنے مریدین کو جہاد وقتال کی تیاری کے لئے ابھارتے تھے، جس کے نتیجہ میں لوگ اپنے اکثر اوقات جنگی تربیت میں بسر کرتے تھے لیکن سفر حج سے واپسی کے بعد سید صاحب نے اپنی تمام سرگرمیاں صرف جہاد کی تیاری میں سمیٹ دیں وہ شاہ اسمعیل شہیدؒ اور مولانا عبدالحی صاحب کو اطراف میں بھیجتے تاکہ وہ لوگوں تک جہاد وقتال کی دعوت پہونچا دیں اور انہیں ہجرت و جہاد پر آمادہ کریں، جیسا کہ ''سوانح احمدی'' میں تحریر ہے:

''سید صاحب نے شاہ اسمٰعیل شہید اور مولانا عبدالحی اور دیگر افراد پر مشتمل ایک وفد ملک کے بعض حصوں میں روانہ کیا تاکہ وہ لوگوں کو اسلام کے دشمنوں کے خلاف جنگ و جہاد کے فضائل بتائیں، اس زمانہ میں سید صاحب کی خانقاہ جنگی فنون کی ٹریننگ حاصل کرنے والوں سے بھری ہوتی، وہاں مراقبہ وریاضت ومجاہدہ کی جگہ نیزہ بازی، شہ سواری اور تیر اندازی نے لے رکھی تھی، پوری خانقاہ میں ایک فرد بھی ایسا نہ ملتا جس کے پاس تسبیح وعمامہ کی جگہ نیزہ یا بندوق نہ ہوتی جس نے سید صاحب کے ساتھیوں میں صوفیاء کی جماعت دیکھی ہوتی وہ اس وقت فوجیوں کو دیکھ کر تعجب میں پڑ جاتا۔''

۱۲۴۱ھ کے آغاز میں سید صاحب نے اپنے اہل وعیال کو الوداع کہا، اور بہت سے مجاہدین کے ساتھ راجہ امیر محمد خاں کی دعوت پر ٹونک کا سفر کیا، راجہ صاحب کو سید صاحب اور ان کی جماعت کی خدمت کی سعادت نصیب ہوئی انہوں نے مجاہدین کو اسلحوں اور ضروریات سے نوازا اور جہاد میں شرکت کی، اور اس دنیا وآخرت کی کامرانی کے حصول کی توفیق ملی۔

سید صاحب کے جذبۂ جہاد اور مجاہدین کے صبر وعزیمت اور مشکلات ومصائب اور شوق شہادت پر ان کی صبر آزمائی کا اندازہ لگانے کے لئے ضروری ہے کہ ہم ہندوستان و پنجاب اور افغانستان کے نقشہ پر نظر ڈالیں اور وہاں کے ریگزاروں، نخلستانی بے

آب وگیاہ پہاڑوں اور وسیع وعریض ریگستانوں اور خطرناک گزرگاہوں، جنگلات اور لمبی چوڑی نہروں کا تصور کریں۔ جنہیں ان مجاہدین نے عبور کیا اور جن سے گزر کر انہوں نے اپنے راستے طے کئے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے پر پیچ اور دشوار گزار راستوں کا عبور کرنا خود اپنے اندر ایک جہاد ومجاہدہ ہے۔

صرف اسی طرح کی چیزیں ان کی راہ کی رکاوٹ نہیں بنیں بلکہ انہوں نے اس کے علاوہ بے شمار مصائب مثلاً پانی کا فقدان، رہزنوں کے خطرات، کھانے کی کمی، اور جداگانہ زبانوں اور قبائل کا سامنا کیا، اور اس جیسی دیگر بہت سی رکاوٹ پیدا کرنے والی پر خطر اور ہیبت ناک چیزیں راہ میں حائل ہوئیں۔ لیکن مجاہدین کے قدموں میں اس سے ذرہ برابر لغزش نہ پیدا ہوئی اور کوئی چیز ان کے پائے استقامت کو ہلا نہ سکی، بلکہ ان مشکلات ومسائل نے تو ان کے جذبۂ جہاد کو مزید تقویت بخشی اور شوق شہادت نے ان کو مزید بے چین وپریشان کر دیا اور یہ ساری چیزیں محض قائد کے اخلاص اور ان کے صدق دلی کی عکاس ہیں۔

مجاہدین کا قافلہ پشاور جاتے ہوئے بہت سے شہروں سے گزرتا اور ٹھہرتا ہوا اور لوگوں کو دعوت جہاد دیتا ہوا گزرا اور اس قافلے کے سپہ سالار کے روحانی اثرات وتاثیر کا یہ نتیجہ ہوا کہ عام لوگوں نے اس پہلو پر توجہ کی اور وہ جہاں بھی جاتے اور قیام کرتے لوگ بھیڑ لگا لیتے اور اپنے جان ومال کو سید صاحب کے قدموں پر پیش کرتے، اور سید صاحب ان کو مجاہدین وغازیوں کی حیثیت سے فوج میں شامل کر لیتے تھے۔

ٹونک سے نکلنے کے بعد سید صاحب سب سے پہلے حیدرآباد میں قیام پذیر ہوئے قافلہ کو یہاں تک پہونچنے میں بڑی جانکاہی وجانفشانی کا سامنا کرنا پڑا، اور مسلمان حکمرانوں اور امراء نے ان کا پرجوش استقبال کیا، اسی کے ساتھ انہوں نے سید صاحب کا بڑا اکرام کیا اور وہاں سید صاحب کا چند روز قیام بھی رہا، سید صاحب نے ان کو اپنے فیوض وبرکات سے نوازا جس کی وجہ سے ان کے اندر دین وتقویٰ کا جذبہ موجزن ہوا اور انہیں گویا

ایمان وشوق کی ایک نئی زندگی ملی، انہوں نے سید صاحب کے ہاتھ پر جہاد وقتال اور راہ خدا میں قربان ہونے کی بیعت کی۔

سید صاحب کا گزر شکار پور سے ہوا اور شہر سے باہر یہ قافلہ ٹھہرا، وہاں علماء اور شرکاء کی ایک جماعت نے آپ سے ملاقات کی، اور شکار پور میں قیام کے دوران حکومت نے ان کے اخراجات برداشت کئے، وہاں سے سید صاحب کابل گئے اور متعدد علاقوں سے گزرتے ہوئے قندھار پہونچے، وہاں سے غزنی اور کابل گئے، سید صاحب جہاں بھی جاتے یا ٹھہرتے ان کا پرجوش خیر مقدم کیا جاتا اور لوگ ایسے اکرام کا معاملہ کرتے جس کی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی، علماء، امراء اور حکمراں اور عوام الناس پورے جوش وخروش اور عقیدت کے ساتھ ملاقات کرتے اور آپ کو ایسا رہنما وقائد شمار کرتے جو صحیح معنوں میں مسلمانوں کو ظلم وجور کے چنگل سے نکال کر رحمت ومحبت اور عدالت ومساوات عطا کرے۔

کابل میں سید صاحب کا قیام ڈیڑھ دو ماہ رہا پھر وہاں سے پشاور کوچ کرنے کا اعلان ہوا، وہاں بھی لوگ ان پر ٹوٹ پڑے، اور لوگوں نے ان سے جہاد پر بیعت کی۔ وہاں سے نوشیرہ گئے اور وہاں کچھ عرصہ قیام کیا۔ وہاں لوگوں کے حالات معلوم کئے اور حکومت وغیرہ کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے حکومت پنجاب کے پاس دعوت اسلام کا مکتوب بھیجا جس دعوت اسلام کے بعد جزیہ یا جنگ کے درمیان اختیار کا فیصلہ دیا، لیکن حکومت نے جنگ کے علاوہ کسی بھی چیز کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اکوڑہ (جو نوشیرہ سے بیس کلومیٹر دور ہے) کے میدان میں ایک بڑی تعداد پر مشتمل فوج کو تیار کیا۔

سید صاحب نے بھی اسلامی لشکر کی تشکیل کی اور جنگ کے لئے اس کو تیار کیا اور سحر کے وقت دشمن پر شب خون مارا اور دونوں فریق آمنے سامنے آئے اور زبردست معرکہ کا آغاز ہوا جس میں دشمن کو شکست فاش ہوئی اور مقتولین کی تعداد سات سو کے قریب پہونچی اور اسی کے قریب لوگ زخمی ہوئے، ۳۷ر مسلمان شہید ہوئے اور ۳۰ر زخمی ہوئے۔ اس سے مسلم فوجوں کی مزید ہمت بندھی۔ اور سید صاحب کے ہاتھ پر امارت وامامت پر

بیعت کی گئی تا کہ فوج میں کوئی انتشار نہ ہو اور وہ ایک نظام سے مربوط رہے اور ایک امام وامیر کی اطاعت وتعلیمات کو اپناتی رہے، سید صاحب نے بیعت کے فوراً بعد اطاعت امیر اور احکام وتعلیمات اسلام پر عمل آوری کا اعلان کیا۔ اور خلاف شرع تمام رائج باتوں سے صرف نظر کرنے اور باز رہنے کا حکم دیا'' کہ اے ایمان والوں اللہ اور اس کے رسول اور اس کے حکمرانوں کی اطاعت کرو۔'' (سورہ نساء)

اس امامت کے نظام نے خیر کثیر چھوڑا اور اس کی بڑی برکتیں سامنے آئیں اور بہت تیزی کے ساتھ نظام شرعی کی تنفیذ اور اختلافات ونزاعات کے شرعی تصفیہ کی راہ ہموار ہوگئی اور سارے لوگ اس نظام کے پیرو ہو گئے ان میں باہم کسی قسم کا اختلاف ونزاع نہ رہا۔

سکھوں کے خلاف اسلامی فوجوں نے کئی معرکوں میں شرکت کی، اور اس میں شجاعت وجوانمردی کا ثبوت دیا، پشاور کو فتح کیا، جب انھوں نے اور دشمن کے طلسم کو توڑ کر حکومت حاصل کر لی۔ اور سید صاحب پشاور میں داخل ہوئے تو پورے شہر نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور تمام مسلمانوں نے کفر وشرک کے اندھیروں سے نکالنے والے ایک قائد ورہنما کا پرزور استقبال کیا، اور انہوں نے سید صاحب کو اپنا امام وقائد تسلیم کیا جو اسلام کا علمبردار تھا جس نے بڑے بڑے معرکوں میں شرکت کی اور دشمن کو تہ تیغ کیا۔ اور اسلام کے لئے ملکوں کو فتح کیا اور پوری دنیا میں مسلمانوں کی عظمت رفتہ کو بحال کیا۔

شہر میں سید صاحب کے داخل ہوتے ہی امن وامان کی فضا چھا گئی انہوں نے مجاہدین کو حکم دیا کہ وہ ناحق کسی کی چیز پر قبضہ نہ کریں اور باشندگان شہر پر کسی طرح کی تعدی اور زیادتی نہ کریں، امن وامان قائم ہو گیا سکون واطمینان چھا گیا، زنان بازاری جن کی پشاور میں بڑی تعداد تھی، روپوش ہو گئیں، اسی طرح شراب وغیرہ کی دوکانیں بھی بند ہو گئیں اور اسلامی قانون کا نفاذ ہوا اور شرعی حدود قائم ہوئیں اور مجرمین اور تارکین نماز پر سزائیں نافذ کی گئیں۔ اور خالص اسلامی سلطنت کا قیام عمل میں آیا، جس میں اسلام ہی کا

بول بالا تھا اور سید صاحب اس حکومت کے فرمانروا اور حاکم بنے۔

ان تمام مساعی ومشکلات میں پڑنے کا واحد مقصد سید صاحب کے نزدیک اعلاء کلمۃ اللہ تھا، اور وہ خدا کی سرزمین پر اس کے قانون کا نفاذ اور اسلامی شریعت کا اجرا چاہتے تھے، اور یہاں دین صحیح کی بنیاد پر صالح اسلامی معاشرہ کی تشکیل کے خواہاں تھے، یہ ایک ایسی آرزو تھی جو ایک زمانے سے ان کے اور ان کے اصحاب کے دل میں انگڑائیاں لے رہی تھی، اور انہوں نے اس آرزو کی تکمیل کے لئے مکمل طور پر تیاری کی، آخر کار وہ میدان کارزار میں کود پڑے اور وہ جس علاقہ کو فتح کرتے اور جہاں بھی وہ غلبہ حاصل کرتے وہاں شریعت اسلامی کو نافذ کرتے، اور اس کے لئے کسی دوسرے موقع اور وقت کا انتظار نہ کرتے بلکہ وہ کسی مصلحت کوشی کے بغیر اس میں بڑی سرعت سے کام لیتے تھے اس راہ میں کوئی چیز ان کی رکاوٹ نہ بنتی تھی اور عزائم کو پست کرنے والی کوئی چیز نہ تھی، جب کہ دشمن تیار تھا اور ظالم نگاہیں سید صاحب کی ہزیمت اور شکست کا نظارہ دیکھنے کی منتظر رہتی تھیں۔

جیسے ہی سید صاحب اپنے قافلے کے ساتھ پشاور میں فاتحانہ داخل ہوئے انہوں نے وہاں پورے طور پر اسلامی نظام کو نافذ کیا اور اس سے ان کو مسرت نصیب ہوئی اور انہوں نے اپنے اس عزم کی تکمیل کی وجہ سے بارگاہ رب العزت میں کلمات شکر ادا کئے اور سید صاحب اور ان کی جماعت کو ایک بے پناہ مسرت وفرحت اور خدا تعالیٰ کی عطا کردہ نعمت واکرام پر رشک وسرور ہوا۔

لیکن بعض اہل پشاور جو اسلامی زندگی سے مانوس نہ تھے اور جاہلیت کی زندگی گزارنے کے عادی تھے۔ ان کو سید صاحب کا وہاں فاتحانہ داخلہ اور اسلامی بنیادوں پر خالص اسلامی روایات کا قیام شاق گزرا۔ خاص طور سے ایک ایسی حکومت جس میں اسلامی حدود وتعزیرات قائم ہوں، اور وہاں اسی کے مطابق سزائیں تجویز ہوں اور دینی شعائر کا احترام کیا جائے، چنانچہ انہوں نے اس کو بہت کم مدت تک برداشت کیا۔ پھر انہوں نے سید صاحب پر ایک زبردست حملہ کیا اور سید صاحب کے بہت سے اصحاب کو قتل کر دیا اور ان

کی بے حرمتی کی، اور کتنے لوگ نماز کی حالت میں رکوع اور سجدے کے دوران شہید کر دئے گئے۔

جب سید صاحب کو بغاوت کی خبر ملی تو ان کے پیروں تلے زمین نکل گئی اور افسوس اور حزن وملال ان پر اس قدر چھا گیا تھا کہ اس پر قابو مشکل تھا، اور سید صاحب کی جماعت کو شکست کی تکلیف اور غدر وبغاوت کے دھوکے نے اس قدر مضطرب کر دیا کہ ان کی ہمتیں پست ہوگئیں اور ان کی شان وشوکت کو ٹھیس پہونچی، سید صاحب نے دوسرے مرکز کی جانب منتقل ہوجانے کی تجویز رکھی، جس میں نئے سرے سے جہد وعمل اور جہاد کا آغاز کیا جائے، ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسی سرزمین میں دین کو غلبہ عطا کرے جہاں انسانوں کا نہیں بلکہ جانوروں اور بھیڑیوں کا تسلط ہو۔

سید صاحب اور ان کی جماعت کے خلاف بغاوت اور ان کے راستہ میں رکاوٹ پیدا کرنے کا سبب علماء سوء کا نفاق تھا۔ انہوں نے سید صاحب کے خلاف غلط پروپیگنڈہ اور بے بنیاد باتیں گڑھیں، انہوں نے سید صاحب کے خلاف سازشوں اور مکر وفریب کا ایسا جال بنا، جس نے سید صاحب کے مقام ومرتبہ کے سلسلہ میں لوگوں کے دلوں میں شکوک وشبہات پیدا کر دئے، اور ان لوگوں نے سید صاحب کے خلاف ایسے منصوبے رچے اور ایسی سازشیں کیں جس سے ان کا اپنے منصب ومقام پر باقی رہنا مشکل ہوگیا جو میدان جہاد کے لئے ایک لازمی عنصر تھا۔ اور جو معاشرہ کے اندر رائج فاسد خیالات وافکار اور برے رسوم ورواج کے خلاف سید صاحب کی کوششوں میں مخل اور حائل ہونے والی چیز تھی یہ علماء کہتے تھے:

''مجاہدین کی یہ جماعت مسلمانوں کے مال وجان کی اہمیت نہیں سمجھتی ہے۔ وہ ان کے جان ومال کے ساتھ کھلواڑ کرتی ہے اور ان کو زبردست خسارے سے دوچار کرتی ہے اور اس جماعت میں بعض لوگ ایسے ہیں جو دین وشریعت کے دشمن ہیں، یہ علماء ان مجاہدین کے خلاف جنگ کرنے والوں کو شہداء میں شمار کرتے تھے۔''

اس کے علاوہ ذاتی طور پر سید صاحب کے متعلق ان لوگوں نے مشہور کیا تھا کہ آپ نہایت درشت مزاج، زود رنج اور غضب ناک آدمی ہیں، کوئی اگر نصیحت کرے یا معقول بات کہے تو ناراض ہوجاتے ہیں اور اس کے ایذا کے درپے ہوجاتے ہیں، سید صاحب نے ان غلط فہمیوں کو رفع کرنے اور ان الزامات کی تردید کے لئے علماء پشاور کے نام ایک پرزور اور مدلل خط لکھا، جو قلمی خطوط کے مجموعے میں شامل ہے اس خط سے سید صاحب کے بہت سے خیالات اور اس وقت کے حالات پر روشنی پڑتی ہے، اس لئے اس خط کے بعض حصے نقل کئے جاتے ہیں:

''سننے میں آیا ہے کہ ان افترا پردازوں کا ایک افترا یہ ہے کہ اس فقیر بلکہ پوری جماعت مجاہدین کو الحاد و زندقہ کی طرف نسبت کرتے ہیں اور اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ان پردیسیوں کا کوئی مذہب نہیں اور یہ کسی مسلک کے پابند نہیں، محض نفسانیت پرست اور لذات نفسانی کے جویا ہیں، خواہ کتاب اللہ کے موافق ہوں یا مخالف، خدا کی پناہ! واضح ہو کہ ہم غریبوں کی اس امر شنیع کی طرف نسبت محض افتراء و بہتان ہے، یہ فقیر اور اس فقیر کا خاندان ہندوستان میں گمنام نہیں ہزاروں ہزار آدمی، کیا خاص اور کیا عام ،اس فقیر کو اس کے بزرگوں کو جانتے ہیں اور ان کو معلوم ہے کہ اس فقیر کا مذہب ابا عن جدٍ حنفی ہے اور اس وقت بھی خاکسار کے تمام اقوال و اعمال احناف کے اصول و قوانین اور فوائد کے مطابق ہیں، ان میں سے ایک بھی ان اصول سے باہر نہیں، ہاں انسان سے بمقتضائے بشریت جو کچھ غلطی ہوجائے اس کا امکان ہے اور اس کے ہوجانے کے بعد اس کا اعتراف ہے اور اگر کوئی تنبیہ کرے، تو رجوع کرنے کے لئے تیار ہوں، البتہ ہر مذہب میں محققین کا طریقہ اور ہوتا ہے اور غیر محققین کا اور، بعض روایتوں کو بعض پر ترجیح دینا دلیل کی قوت کا لحاظ کرکے سلف سے منقول ہے، عبارتوں کی توجیہ مختلف مدون مسائل میں تطبیق دینا اور اس طرح کی باتیں اہل تدقیق و تحقیق کا ہمیشہ سے دستور رہا ہے، محض اتنی سی بات پر وہ مذہب سے خارج نہیں ہوجاتے، بلکہ ان لوگوں کو اس مذہب کے پیروؤں کا لب لباب سمجھنا چاہئے، جس شخص کو اس مسئلے میں کچھ شبہ ہو، اس کو چاہئے کہ اس فقیر کے پاس آکر زبانی اور رُودرُو اس اشکال کو حل کرے یا خود سمجھ لے یا اس

فقیر کو سمجھا دے۔"

مسلمانوں کے جان و مال کی بے وقعتی اور دست درازی کے الزام کا جواب دیتے ہیں:

"ان افترا پردازوں کا ایک افترا یہ ہے کہ اس فقیر پر ظلم اور دست درازی کا الزام لگاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے جان و مال پر بلاوجہ شرعی دست اندازی کرتا ہے اور اس بارے میں چرب زبانی اور حیلہ سازی سے کام لیتا ہے" سبحنك هذا بهتان عظيم! اس فقیر نے تو کبھی کسی کو بلاوجہ شرعی ایک کوڑا بھی نہ مارا ہوگا۔ بلکہ بلاوجہ کتے کو بھی مارنا اس کی عادت نہیں، جس شخص کو چند دن بھی اس کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا اس کو ضرور اس بات کا علم ہوگا باقی اللہ نے اس ناچیز کے ذریعے بعض منافقین و مرتدین کی جو سرزنش اور گوشمالی فرمائی ہے، اس کو میں اپنی انتہائی سعادت اور اللہ کے یہاں مقبولیت کی علامت سمجھتا ہوں، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اعانت دین میں غیرت اور معاندین کی اہانت و تذلیل کا شوق ایمان کے لوازم میں سے ہے، جس میں غیرت ایمانی نہیں، حقیقت میں ایمان سے عاری ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يـاايهـاالـذين اٰمنوا من يرتد منكم عن دينه فسوف يأتى الله بـقـوم يـحبهم ويـحبـونـه، اذلة عـلـى الـمـؤمـنين اعزة على الكافرين، يجاهدون فى سبيل الله ولا يخافون لومة لائم۔ (المائده :٥٤)

اے لوگو! تم میں سے جو اپنے دین سے پھر جائے (تو اللہ کو کچھ پروا نہیں) کہ وہ عنقریب ایسے لوگوں کو لے آئیگا جو مؤمنین کے حق میں نرم ہوں گے، کافروں کے حق میں سخت، اللہ کے راستے میں جہاد کرتے ہیں اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا نہ کریں گے۔

وقـال الـله تعالىٰ يا ايهاالنبى جاهدالكفار والمنافقين واغلظ عليهم وما واهم جهنم۔ (التوبة:٢٣)

"اور فرمایا اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم صاحب، کفار اور منافقین سے جہاد

کرواوران پرسختی کرواوران کا ٹھکانا جہنم ہے۔"

اوراگر بالفرض کوئی چیز اس فقیر کے ہاتھ سے ایسی صادر ہوئی ہو، تو فقیر کو وعظ ونصیحت کے ذریعہ اس پر آگاہ کردیا جائے، نہ یہ کہ محفلوں اور مجلسوں میں اس کی غیبت کی جائے اور فقیر کو سہوونسیان پر نشانۂ طعن بنایا جائے اور محض اس بنا پر جہاد میں اس کی رفاقت اور جماعت مجاہدین کے ساتھ شرکت چھوڑ دی جائے حدیث میں آیا ہے:

"الجهاد ماض الى يوم القيامة لا يبطله جور جائر ولا عدل عادل" جہاد قیامت تک باقی رہے گا، کسی ظالم کا ظلم اور کسی منصف کا انصاف اس کو اٹھا نہیں سکتا۔ یہ حدیث علماء حدیث کے یہاں مشہور ہے۔

مختصراً اس فقیر کی تمام علماء وقت سے یہی درخواست ہے کہ تمام مسلمانوں کو بالعموم اور اس فقیر کو بالخصوص بھلائی کا حکم دیں اور برائی سے روکیں اور سیدھے راستے کی رہ نمائی کریں اور جس اعتراض واشکال کا غیبت میں ذکر کرتے ہیں اس کو رو در رو شرعی دلائل سے ثابت کریں اور اس فقیر کا رخ خود پرستی سے خدا پرستی کی طرف موڑ دیں، وہ اس کے لئے بالکل تیار ہے کہ اگر اپنے اقوال وافعال میں سے کوئی ایسی چیز اس کو معلوم ہو جو خدا اور رسول کے حکم کے مخالف ہو تو وہ فی الفور اس سے توبہ کرے گا اور سیدھے راستہ کی طرف لوٹ آئے گا اگر معترضین جو اس فقیر کے اقوال وافعال پر اعتراض کرتے ہیں اور ان کو مخالف شرع سمجھتے ہیں، اگر خود اس کو اس کی اطلاع نہ کریں گے اور کچھ زحمت سفر برداشت کرکے بالمشافہ اس کو ثابت نہ کریں گے تو اس کا وبال انہیں کی گردن پر ہوگا۔

اور بعض دروغ گو کم عقل اور مفسدوں نے جو یہ مشہور کر رکھا ہے کہ علماء وفضلاء میں سے جو صاحب اس فقیر کو بھلائی کی تلقین کرتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں، یہ فقیر ان کے ساتھ قہر وغضب سے پیش آتا ہے اور ان کی جان ومال کو نقصان پہنچاتا ہے اور اپنے ہاتھ اور زبان سے ان کو کسی نہ کسی طرح آزار پہونچاتا ہے، پس یہ بات محض بے اصل وبے بنیاد ہے اور محض بہتان وافتراء، بار بار کفار ومنافقین کے جاسوس گرفتار ہوئے ہیں اور ان سے خفگی کی بات بھی نہیں کی، بلکہ ان کو تکلیف دینے سے بھی احتراز کیا ہے اور ان کو عافیت وسلامتی کے ساتھ رہا کردیا گیا ہے، جب کفار اور منافقین کے

جاسوسوں کے ساتھ ایسا معاملہ روا رکھا ہے تو کوئی عقلمند آدمی یہ باور کرسکتا ہے کہ یہ فقیر علماء وفضلاء کے ساتھ محض فریضۂ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی بجا آوری کی پاداش میں غصہ کی بات یا خلاف شان گفتگو کرے گا؟ یہ بات ایمانی اخلاق اور انسانی مروت سے بہت بعید ہے، ایسے کام سے خدا کی پناہ۔''

اس کے بعد سید صاحب نے دوسرا مرکز بنانے کی کوشش کی اور انہوں نے بعض اسباب سے پنجاب سے منتقل ہوکر کشمیر کو قیام کے لئے انتخاب کیا، اور اس کے لئے پوری تیاری کرلی، انہوں نے بعض داعیوں کو جمع کیا، ان کی خدمات کا اعتراف کیا اور ان کا شکریہ ادا کیا اس کے بعد اپنے ارادہ سے ان کو مطلع کیا اور ان سے اس سلسلہ میں بعض کلمات کہے جنہوں نے ان کے دلوں پر اثر کیا اور وہ سید صاحب کے فراق کی وجہ سے بے چین ہوگئے، انہوں نے کہا: کہ ہم آپ کی جدائی برداشت نہیں کرسکتے اور پوری زندگی آپ سے علیٰحدہ نہیں ہوسکتے، اور ہر ایک نے دین کی خدمت اور اسلام کے استحکام کے لئے اپنی جان کو پیش کیا۔

سید صاحب نے چند ماہ بعد ان کو رفاقت کی اجازت دے دی اور رجب ۱۲۴۶ھ میں وہاں سے کوچ کا اعلان ہوا، اس منظر سے پوری فضا رنج وملال سے پر نظر آتی تھی، سید صاحب کے پنجاب سے رخصت ہوتے ہی وہاں سے امن وامان بھی رخصت ہوگیا، سکھوں نے پنجاب پر حملہ کردیا اور ان پر ایسا شب خون مارا کہ وہ اس سے پہلے اس کا اندازہ نہیں کرسکتے تھے، اس کے نتیجہ میں لوگ خانماں برباد ہوگئے، کتنی جانیں ضائع ہوئیں اور کتنے گھروں کو نذر آتش کردیا گیا اور نہ جانے کتنے انسانوں کی عزت پامال کی گئی۔

پشاور سے سید صاحب بالاکوٹ پہنچے، راستہ میں سکھوں سے چند جھڑپیں ہوئیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس قیمتی جوہر اور مسلمانوں کے سرتاج کے لئے سرزمین بالاکوٹ میں مدفون ہونا مقدر کررکھا تھا۔

ذیل میں سید صاحب کے اس مکتوب کا نمونہ پیش کیا جارہا ہے جسے آپ نے شہادت کے صرف گیارہ روز قبل نواب وزیر الدولہ کو ۱۳ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ کو تحریر کیا تھا، اس خط سے مقصد جہاد اور مسلمانوں کی زبوں حالی کی وجہ سے ان کے قلق واضطراب کا پتہ چلتا ہے، اس سے اندازہ ہوگا کہ وہ مسلمانوں کی شان وشوکت اور ان کی عزت وسربلندی کے لئے کس قدر فکر مند رہا کرتے تھے، اور وہ مسلمانوں کے سینوں پر سوار ظالم سامراج کے استبداد سے نجات دلانے کے لئے کتنا بے چین رہا کرتے تھے، وہ تحریر کرتے ہیں:

''باقی حال یہ ہے کہ اہل سمہ چونکہ بد بخت ازلی تھے، انہوں نے جہاد کے بارے میں مجاہدین کی رفاقت اختیار نہیں کی، بلکہ کافروں کے اعزاز سے بعض مجاہدین ابرار کو، جو بعض ضرورتوں سے اپنے لشکر سے نکل کر گاؤں میں متفرق ہو گئے تھے اور منتشر تھے، بے خبری میں شہید کر دیا، اگر چہ اصل لشکر ان کے گزند سے محفوظ اور خدمت دین کے لئے مستعد، خصوصاً ان منافقین کو زیروزبر کرنے اور ان سرکشوں سے انتقام لینے کا آرزومند تھا، لیکن چونکہ وہاں ٹھہرنے سے اصل مقصود یہی تھا کہ مسلمانوں کی بڑی جماعت، مجاہدین کی رفاقت اختیار کر کے کفار کا مقابلہ کرے اور اس چیز کی اب ان سے بالکل توقع نہیں رہی، اس لئے وہاں سے ہجرت کر کے پکھلی کے پہاڑوں میں آ گیا ہوں، ان پہاڑوں کے رہنے والے حسن اخلاق سے پیش آئے اور جہاد کے بارے میں انہوں نے پختہ وعدے کئے اور اپنے وطن میں انہوں نے رہنے کے لئے جگہ دی۔ چنانچہ فی الحال بالاکوٹ کے قصبے میں کہ اس کے دروں میں سے ایک درہ میں واقع ہے، جمعیت خاطر کے ساتھ ٹھہرا ہوا ہوں اور کفار کا لشکر بھی مجاہدین کے مقابلہ کے لئے تین چار کوس کے فاصلے پر ڈیرہ ڈالے ہوئے ہے، لیکن چونکہ مقام مذکور نہایت محفوظ ہے، لشکر مخالف خدا کے فضل سے وہاں تک پہونچ نہیں سکتا، ہاں اگر مجاہدین خود پیش قدمی کریں اور ان سے نکل کر لڑیں تو جنگ ہوسکتی ہے، مجاہدین کا ارادہ ہے کہ دو تین روز میں جنگ کی جائے، بارگاہ واجب الحیات سے امید یہی ہے کہ فتح ونصرت کے دروازے کھول دے گا، اگر اللہ کے حکم سے تائید ربانی شامل حال رہی اور یہ جنگ کامیاب رہی تو انشاء اللہ در یائے جہلم وملک کشمیر تک مجاہدین کا قبضہ ہوجائے گا۔ دن رات دین کی ترقی اور لشکر مجاہدین کی کامرانی کے لئے دعا کرتے رہیں۔ والسلام

شیر سنگھ نے اپنے لشکر و موافقین کو ہر گوشہ و ہر جانب سے جمع کر لیا اور ہر دو فرسخ کی مسافت پر ایک فوجی بیرک قائم کیا، وہاں بالاکوٹ جانے کے لئے دو ایسے راستے تھے جو پہاڑ پر ہو کر گذرتے تھے اور شہر کے چند باخبر لوگوں کے علاوہ ان سے کوئی دوسرا واقف نہ تھا۔

دوسرا راستہ ایک چھوٹے سے پل کے ذریعے لاہور تک جاتا تھا، سید صاحب نے دونوں راستوں پر لشکر کے دستوں کو متعین کر دیا تا کہ دشمن اس راستہ سے بالاکوٹ میں نہ داخل ہو سکے۔

مجاہدین فتح و کامرانی کے آثار اپنی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے، اور فتح کے وہ بہت قریب پہونچ چکے تھے، اور شکست و ہزیمت کے اعتراف کے ساتھ دشمن اپنے انجام کو پہونچنے ہی ہونے والا تھا کہ اچانک وہ حادثہ جانکاہ پیش آیا جس کی توقع بھی نہیں تھی، اور جس کا خیال تک ذہن و دماغ کے کسی گوشہ میں نہ آیا تھا اور یہ مسلمانوں کے لئے ایک بہت بڑا سانحہ اور المیہ تھا۔

راستہ میں مامور مجاہدین میں سے ایک شخص شیر سنگھ کے پاس آیا اور راستہ کے راز کو اس نے تفصیل کے ساتھ شیر سنگھ پر افشا کر دیا، وہ اس کے فوجیوں کے ساتھ آیا اور انہیں قاعدہ سے راستہ بتا دیا، اس چیز نے شیر سنگھ اور اس کے قافلہ کے اندر ایک نئی زندگی پیدا کر دی اور مسلمانوں پر شب خون مارنے کے لئے ایک نیا عزم و حوصلہ پیدا کر دیا راتوں رات اس نے تیاریاں کیں اور راستہ کے محافظین کے اوپر حملہ کر کے پوری گزرگاہ پر قبضہ کر لیا اور اس کی فوج پہاڑوں اور راستوں میں ٹڈیوں کی طرح پھیل گئی۔

مجاہدین نے اچانک اس دردناک منظر کو دیکھا اور سید صاحب اس کی تہہ تک پہونچ گئے اور سمجھ گئے اس کے پیچھے کیا راز ہو سکتا ہے، ان لوگوں نے بھی جہاد اور دشمن سے جنگ کی تیاری کی، ان کے دلوں میں خوف و بزدلی کے آثار تک نہ تھے اور نہ ہی ان پر اس اچانک حملہ کا کوئی رعب داخل ہوا وہ پر جوش ہو کر جنگ اور شہادت کے لئے سینہ سپر ہو گئے، انہوں نے جب موت کو نگاہوں کے سامنے دیکھا تو وہ مسرور و شادماں ہو گئے اور باہم ایک

دوسرے کو مبارکباد دینے لگے سید صاحب نے جنگ کی تیاری کی ان کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا اور ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ جنت کو اپنی نظروں کے سامنے دیکھ رہے ہوں۔

فوج کے سپہ سالار میدان جنگ میں اترے، انہوں نے فوج کو منظم کیا اور پوری شجاعت و جوانمردی کے ساتھ انہوں نے دشمن کا مقابلہ کیا، انہیں کے درمیان شاہ اسمٰعیل شہید کی بھی شخصیت موجود تھی جنہوں نے زبردست لڑائی لڑی اور جوانمردی و بہادری کے نادر واقعات ان کے ذریعہ پیش آئے انہوں نے میدان جنگ میں بڑی بہادری اور عزم راسخ کا ثبوت پیش کیا یہاں تک کہ ان کی آرزو پایۂ تکمیل کو پہنچی آخر کار یہ امام جلیل راہ خدا میں شہادت کا جام پی کر دنیا سے جدا ہوا اور انہیں دین و دنیا کی ایسی کامرانی ہاتھ لگی جس سے بعد کے بہت سے لوگ محروم ہیں، ان کی پاکیزہ روح پر اللہ کی سلامتی ہو۔

میدان کارزار گرم تھا، گھمسان کی جنگ جاری تھی، مسلمان کافروں سے برسر پیکار تھے، چنانچہ کہیں وہ شہید ہوتے تو کہیں دشمنوں کو جہنم رسید کرتے انہوں نے اللہ سے کئے ہوئے وعدے کو سچ کر دکھایا۔

"ان اللہ اشتری من المؤمنین انفسھم واموالھم بأن لھم الجنۃ یقاتلون فی سبیل اللہ، فیقتلون ویقتلون-(توبہ : ۱۱۱)

ترجمہ: اللہ نے خرید لی مسلمانوں سے ان کی جان اور ان کا مال اس قیمت پر کہ ان کے لئے جنت ہے، لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں پھر مارتے ہیں اور مرتے ہیں۔

اس دوران امام سید احمد شہیدؒ نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں وہ دشمن سے بڑی سرفروشی اور جانفشانی کے ساتھ معرکہ آرا ہوتے ہیں اور اسی درمیان اللہ تعالیٰ ان کو شہادت کا جام عطا فرماتا ہے اور انہیں سچی شہادت نصیب ہوتی ہے۔

جب جنگ اپنے شباب پر آئی تو مسلمانوں کا جوش و جذبہ فزوں تر ہو گیا انہوں نے نہ ہمت ہاری اور نہ ہی پیچھے ہٹے بلکہ اپنی آخری سانس تک وہ معرکہ آرا رہے، بعض اہم مسلمانوں کی شہادت سے جنگ کا فیصلہ نمایاں ہو گیا، اور شیر سنگھ اپنی سرزمین پر اپنی حکومت اور تخت سلطنت کو قائم کرنے پر قادر ہو گیا جو پاک شہیدوں کے خون سے لالہ زار تھا

اور جوان کے انفاس قدسیہ سے معمور و آباد تھا۔

یہاں بعض منافقوں کی غلطی کی وجہ سے مسلمانوں کا ستارہ اقبال ڈوب گیا، اور عصر حاضر کے مسلمانوں کی تاریخ کا باب مومنین کی اس شجاعت و جواں مردی تک پہونچ کر بند ہو گیا، اور ہندوستان میں شرعی حکومت ایک خواب و خیال بن گئی جس کی تکمیل صدیوں تک ممکن نظر نہیں آتی، تاریخ کئی سو سال پیچھے چلی گئی، اور مسلمانوں کا قافلہ بالآخر ساحل مراد سے نہ لگا، وہیں پہونچ گیا جہاں سے اس نے رخت سفر باندھا تھا اور بالاکوٹ کی سرزمین میں ۲۴ رذوالقعدہ ۱۲۴۶ھ کو تاریخ اسلامی کا یہ عظیم سپوت اور ایک مجاہد جلیل پیوند خاک ہو گیا۔

اور کتاب وسنت کی بنیاد پر حکومت کا قیام اور جہاد کا ورق تمام ہوا اور تاریخ نے شجاعت و جواں مردی اور جوش وولولہ کا ایک بے مثال نمونہ اور اللہ تعالیٰ کے راستہ میں فنا ہو جانے کی ایک نادر مثال رقم کی۔

سید صاحب کے اصحاب میں سے باقی اصحاب اور جماعت مجاہدین استھانہ چلے گئے وہاں انہوں نے ایک فوجی مرکز قائم کیا اور اسلامی بنیادوں پر ایک حکومت قائم کی اور انہوں نے اپنے اسلاف کے نقش قدم کو اختیار کیا جنہوں نے خدا کے راستہ میں اپنی جان قربان کر دی اور انہوں نے ان کی سیرت اور اسوہ کو اپنے لئے مشعل راہ بنا لیا اور وہ ان کی ملاقات کے مشتاق اور اس دن کے منتظر تھے جس دن ان کی خدا تعالیٰ کے یہاں ان سے ملاقات وزیارت ہوگی۔

من المؤمنين رجال صدقوا ماعاهدوا الله عليه فمنهم من قضى نحبه ومنهم من ينتظر وما بدلوا تبديلا . (احزاب: ۲۳)

ترجمہ: ایمان والوں میں کتنے مرد ہیں کہ سچ کر دکھلایا جس بات کا عہد کیا تھا اللہ سے، پھر کوئی تو ان میں پورا کر چکا اپنا ذمہ اور کوئی ہے ان میں راہ دیکھ رہا اور بدلا نہیں ایک ذرہ۔

اگر چہ سید صاحب اپنے مشن اور اپنے منصوبہ میں بظاہر ناکام رہے اور ہندوستان میں اسلامی حکومت نہ قائم کر سکے اور اس خواب کو شرمندۂ تعبیر ہونے سے پہلے ہی

وہ راہ خدا میں شہید ہوگئے لیکن اس کے باوجود انہوں نے ساری دنیا کے مسلمانوں کے سامنے اپنی زندگی میں ایک ایسے عالم ربانی کا نمونہ پیش کردیا جو میدان کارزار کا بھی غازی تھا اور جس نے علم وعرفان کے بلند مراتب بھی طے کئے تھے، وہ بیک وقت شمشیر وسنان اور ایمان وعمل کی طاقت وقوت کا مالک تھا، جو سطوت ورفعت رکھنے والے ملکوں کو چیلنج کرسکتا ہو اوران سے پورے جوش ایمانی اور سیف وقلم کی طاقت سے مقابلہ کی تاب رکھتا ہو، اور جو کفر وباطل کے لئے چیلنج کی حیثیت رکھتا ہو، جس کی قیمت پوری کائنات نہ بن سکے اور جو شہادت کو اپنا کر حکومتوں کو ٹھکرا سکتا ہو اور جس کے آگے ہر چیز ہیچ ہو اور بڑے بڑے ظالم وجابر حکمراں اور بادشاہ وشہنشاہ جس سے لرزتے ہو۔

سید احمد شہید۔ ان کی پاک روح پر خدا کی سلامتی ہو اپنے وطن سے دور، شرک وکفر کے دیار میں تقریباً ڈیڑھ صدی قبل شہید ہوگئے، لیکن اتنا عرصہ گذر جانے کے باوجود خدا کے راستے میں قربانی اور شجاعت وفنائیت کی یہ مثال آج بھی زندہ وتابندہ ہے اور یہ واقعہ رہتی دنیا تک لوگوں کے لئے عزم وحوصلہ پیدا کرنے کا وسیلہ اور ان کے دلوں کی سرد انگیٹھیوں کو گرم کرنے کا ذریعہ ثابت ہوگا۔

آج بھی عالم اسلام ایک ایسے شخص کا منتظر ہے جو سید احمد شہیدؒ کی طرح کمر بستہ ہوکر میدان عمل میں کود پڑے، آج عالم اسلام کو سید صاحب کی روح، ان کے ایمان اور جواں مردی کی کل سے کہیں زیادہ ضرورت ہے، وہ تاریخ کے فیصلہ کا منتظر ہے کہ کب ایسی شخصیت نمودار ہو جو اس ایمان کا آئینہ دار ہو جو بزم حق وباطل میں فولاد کی طرح آئے، اٹھے اور پورے عالم اسلام میں حرکت وعمل اور جذبۂ جہاد کا صور پھونک دے، اور ان کے مردہ دلوں میں ایک نئی زندگی اور روح دوڑا دے۔

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب وگل ویراں، وہی تبریز ہے ساقی
نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

مولانا ولایت علی صادق پوریؒ

(۱۲۰۵ھ.....۱۲۶۹ھ)

ایک نوجوان جسے اپنے والدین کی بے پناہ محبت اور اپنے خاندان کے بیش بہا پیار کا وافر حصہ ملا، اس نے دنیاوی نعمتوں میں سے اللہ کے بے شمار انعامات سے فیض اٹھایا اور عیش وتنعم کی زندگی اس کے نصیب میں آئی، دنیا کی فارغ البالی اور زندگی کی مسرتوں نے اسے اپنی گود میں بھر لیا، وہ اپنے طرز حیات میں ممتاز و یکتا اور اپنے اوپر خدا کی عطا کردہ نعمتوں پر رشک کناں تھا، ریشم ودیباج کے لباس اس کے تن بدن کی زینت بنتے اور لذیذ وعمدہ کھانا اس کے دسترخوان پر آراستہ ہوتا، خوشبو ایسی استعمال کرتے کہ پوری فضا معطر ہو جاتی، اور جب ان کی انگلیوں میں سنہری سونے کی انگوٹھی پر کسی کی نظر جاتی تو نگاہ بس وہیں ٹک کر رہ جاتی، حقیقت یہ ہے کہ عیش وخوشحالی کے وہ ایسے مرتبہ پر فائز تھے کہ جس کی طرف لوگ رشک کی نگاہوں سے دیکھتے ہوں، اور اس مقام پر فائز ہونا شاید ہی کسی کے نصیب میں ہوتا ہے۔

اگر دنیاوی خوشحالی وفارغ البالی کی طرف دیکھا جائے تو یہ نوجوان شخص ناز ونعمت اور عیش وتنعم کی بلند چوٹی پر فائز تھا، اور اگر حسب ونسب پر غور کیا جائے تو اس کا خاندان پاکیزہ نسبی اور شرافت میں ممتاز ویگانہ تھا، اس کا ایسے خانوادہ سے تعلق تھا جس کے مقدر میں سیادت وقیادت گویا ابدالآباد کے لئے رقم کر دی گئی ہو، ان کے دادا کا صوبہ بہار کے حاکم اور وہاں کے سربرآوردہ افراد اور رئیسوں میں شمار ہوتا تھا، اس لئے ان کا خاندان ایک جانب شرافت وعزت کی علامت کے طور پر مشہور ہوا تو دوسری جانب مالداری

وثروت کی بنا پر بھی اس کی شہرت ہوئی، لیکن اس کے باوجود دین وعقیدہ میں ثبات واستقامت اور علم وعلماء سے محبت ان کا طرّہ امتیاز رہا۔ اس طرح انہیں دین ودنیا کی کامرانی اور مادہ وثروت کے حصہ وافر دونوں کے حصول میں قدرت حاصل ہوئی۔

یہ نوجوان شخصیت، ولایت علی بن شیخ فتح علی کی تھی، ان کی ولادت صادقپور پٹنہ میں ۱۲۰۵ھ میں ہوئی ان کا خاندان دین سے عشق، دنیا کی سعادت وخاندان ونسب کی عزت وسربلندی اور جاہ ومرتبت سے بہرہ ور تھا، جب مولانا صادق پوری چار سال کے ہوئے تو ان کا گاؤں کے مکتب میں داخلہ ہوا، اور بارہ سال کی عمر میں انہوں نے ابتدائی علوم سے فراغت حاصل کی، اور اس کے بعد لکھنؤ آ کر تعلیم مکمل کی، انہوں نے شیخ محمد اشرف صاحب سے دینی علوم کی کتابیں پڑھیں۔ ایک موقع پر لکھنؤ میں سید احمد شہیدؒ کا جانا ہوا تو وہاں آپ نے ان کے بعض مواعظ سنے اور بس انہیں کے ہو کر رہ گئے۔

یہی مواعظ ان کی حالت کی تبدیلی کا سبب بنے، اور ان کی زندگی کے رخ نے ایک نیا موڑ لیا، اس کے بعد اس نوجوان نے عیش وتنعم کی زندگی سے کنارہ کشی اختیار کی، اور خوش حالی وعیش کوشی کے وسائل سے یکسر قطع تعلق کر لیا اور اپنی بقیہ زندگی سید احمد شہیدؒ کے ایک خادم بن کر ان کے دیگر مریدین ومتبعین کی طرح ایک عام انسان کی طرح گزار دی اور اپنی مرفہ الحالی وخوشحالی کے ایام کو ایک قصۂ پارینہ کی طرح فراموش کر دیا۔

انہوں نے اپنی زندگی کے سفر کو نئے سرے سے شروع کیا، اور اپنی گزشتہ زندگی پر وہ نادم وپشیمان ہوئے کہ انہوں نے اسے لاپرواہی کی حالت میں گذار دیا، اور سارا وقت عیش وعشرت، ناز ونعم اور آرام وراحت کے نذر کر دیا جو نہ ہی ایک مسلمان کو زیب دیتا ہے اور نہ تو اس دنیاوی زندگی کا مقصود ہے۔

انہوں نے اپنی گذشتہ زندگی کی کوتاہیوں کی تلافی چاہی اور اس مقصد کے لئے سید صاحب کے ہاتھ میں ہاتھ دینے اور ان کے حلقۂ مریدین ومتبعین میں شمولیت کی درخواست کی، سید صاحب نے ان کے اخلاص وایمان کی قدر کرتے ہوئے اور یہ سمجھتے

ہوئے کہ یہ توجہ ورغبت اور دل سے نکلی ہوئی ایک صدا ہے اسے قبول کیا، اگر حقیقت اس کے برعکس ہوتی تو یہ مرفہ الحال نوجوان جس پر ناز ونعمت اور رفاہیت وثروت کے آثار نمایاں تھے وہ اس جانب ہرگز توجہ نہ کرتا اور اتنی سرعت وتیزی کے ساتھ وہ اس کی جانب قدم نہ بڑھاتا اور بدحالی اور سخت کوشی کی زندگی کو عیش کوشی اور مرفہ الحالی کی زندگی پر کبھی بھی ترجیح نہ دیتا۔

نوجوان ولایت علی نے ہر سرور وسرمستی اور ہر نعمت وآرائش کو خیر باد کہا اور سید صاحب اور ان کے اصحاب کے ساتھ رائے بریلی میں ان کی صحبت اختیار کرلی، اور پوری عمر تحقیق ومطالعہ، ریاضت ومجاہدہ میں گذار دی، اور وہ اپنا بیشتر وقت عبادت وریاضت اور انابت الی اللہ اور ذکر ونوافل میں صرف کرنے لگے اس کے ساتھ وہ جنگی فنون کی مشق اور دشمنان خدا سے جہاد وقتال کی تیاری میں بھی اپنا بہت سا وقت گزارا کرتے تھے تاکہ اس کے ذریعہ اس دنیا میں خدا تعالیٰ کا کلمہ بلند ہو۔

شاہ اسمعیل شہیدؒ کے درس حدیث میں بھی شریک ہوتے اور جب موقع ملتا تو جنگلوں اور باغات کی طرف نکل جاتے اور وہاں سے لکڑیاں کاٹ کر لاتے اور اپنے سر پر بھاری بھاری بوجھ اٹھاتے اور اپنے ہاتھ سے کھانا تیار کرتے اور تعمیراتی کاموں کو بھی انجام دیتے چنانچہ مستقل مٹی اور اینٹ اٹھانے کی وجہ سے ان کے چہرے کی رنگت تبدیل ہوگئی تھی اور کام اور خدمت اور عبادت وریاضت کی کثرت کے باعث ان کا جسم بہت زیادہ کمزور ہوگیا تھا، اس سلسلے میں ان کے عجیب وغریب واقعات بھی قابل ذکر ہیں۔

ان میں ایک واقعہ یہ ہے کہ ولایت علی کے والد شیخ فتح علی نے ایک بار اپنے خادم کو اپنے بیٹے ولایت علی کے پاس ایک خطیر رقم اور کپڑوں کے ساتھ بھیجا، یہ خادم پہلے ولایت علی کی خدمت پر مامور تھا، جب خادم رائے بریلی پہونچا تو اس نے لوگوں سے ولایت علی کے بارے میں دریافت کیا، لوگوں نے ان کا پتہ بتادیا اس وقت وہ عمارت سازی کے لئے مٹی تیار کرنے میں لگے ہوئے تھے، اور مزدوروں کے کپڑے پہنے ہوئے تھے، اس سخت مشقت کی وجہ سے ان کے چہرہ کی رنگت بھی بڑی حد تک تبدیل ہوچکی تھی، اس لئے

خادم ان کو پہچان نہ سکا اور پوچھا کہ شیخ ولایت علی عظیم آبادی کہاں ملیں گے؟ تو شیخ نے جواب دیا کہ وہ تو میں ہی ہوں، لیکن خادم نے بے اعتنائی سے کہا کہ میرا مطلب تم سے نہیں ہے بلکہ شیخ ولایت علی بن شیخ فتح علی اور ریاست بہار کے حاکم سید رفیع الدین کا نواسہ مراد ہے، تو شیخ ولایت علی نے ان سے کہا بھائی صادق پوری ولایت علی تو میں ہی ہوں، وہ نوکر اور خفا ہوا اور بولا کہ تم مجھ سے ہنسی کرتے ہو؟

دعوت واصلاح اور اخلاص وروحانیت کے عمل میں اس فنائیت کی وجہ سے وہ دین میں بلند مقام پر فائز ہوئے اور اس امانت کو بہتر طور پر انہوں نے انجام دیا۔

جب مولانا ولایت علی سید احمد شہیدؒ کے رنگ میں پورے طور پر رنگ گئے تو ان کے اہل خاندان نے انہیں سید صاحب کی کامل اتباع اور ان کو اسوہ بنانے اور دین وزندگی کے تمام امور میں انہیں کی سربراہی کو اپنانے پر ابھارا اور جب سید صاحب حج کے لئے تشریف لے گئے تو انہوں نے ولایت علی صاحب کو دعوت واصلاح اور دین اسلام کی تبلیغ، لوگوں کی تعلیم وتربیت پر مامور کیا اور جب سید صاحب نے جہاد کا قصد کیا تو شیخ ولایت علی تمام لوگوں میں سب سے زیادہ اس کے لئے پرجوش ہوئے اور دشمن سے جہاد کرنے کے لئے تیاری میں سب سے پیش پیش تھے، لیکن اس وقت سید صاحب نے انہیں سفارت کے کام سے کابل بھیج دیا جہاں انہوں نے ڈیڑھ ماہ قیام کیا، اور وہاں دوران قیام اپنے روزانہ کے مواعظ ومحاضرات کے ذریعہ انہوں نے عوام سے ربط وتعلق پیدا کیا، اور انہیں دشمن سے جنگ وقتال پر آمادہ کیا، ان کے دلوں میں دین کے لئے مر مٹنے اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے فنا ہوجانے کی رغبت پیدا کی، اور انہیں شرک کے ہر شائبہ سے خالص توحید کو اختیار کرنے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل پیروی اور ان کی مکمل اقتدا پر ابھارا۔

شیخ ولایت علی کابل سے بمبئی اور حیدرآباد واپس آئے اور وہاں چند ہی روز کے قیام میں حیدرآباد کے اطراف اور دور دراز کے علاقوں میں ان کی شہرت وناموری ہوگئی۔

امیر مبارز الدولہ (حاکم حیدرآباد دکن) ان کے پاس تشریف لائے ان سے بیعت کی، اور لوگوں نے مسلک ومشرب کے اختلاف کے باوجود ان سے استفادہ کیا، اور ان کی مجلسوں سے فیض اٹھایا جن میں وہ روزانہ وعظ کہتے تھے اور حدیث کا درس دیا کرتے تھے، یہاں تک کہ لاکھوں لوگوں نے توبہ کی، دعوت وارشاد کے اس عمل میں جب وہ حیدرآباد میں مشغول تھے اسی دوران انہیں سید صاحب کی شہادت اور واقعہ بالاکوٹ کی جانکاہ خبر ملی، اس خبر سے ان کو سخت صدمہ پہونچا۔

اس کے بعد دعوت واصلاح اور سید صاحب کے مشن کو فروغ دینے کی ذمہ داری پہلے سے کہیں زیادہ شیخ ولایت علی کے سر آئی اور انہوں نے محسوس کیا کہ ان کی ذمہ داری کہیں زیادہ بڑھ چکی ہے اور ان کا ناتواں جسم اس بار کو اٹھانے کی تاب نہیں رکھتا لیکن انہوں نے خدا تعالیٰ پر پورا بھروسہ کیا اور اپنے اس مشن اور کار دعوت کے لئے اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کی، اور سید صاحب کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے کے لئے کمر ہمت کسی، اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس قول "وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل، أفإن مات أو قتل انقلبتم على اعقابكم" سے تسلی وروشنی حاصل کی۔ انہوں نے اپنے اندر ایک نیا عزم وحوصلہ پیدا کیا اور نیا جوش وخروش محسوس کیا چنانچہ اپنی تمام مساعی اور حقیر جان کو دعوت دین کے لئے پیش کر دیا، اور انہوں نے لوگوں کی جانب سے بے پناہ شوق محسوس کیا اور لوگوں کے اندر اتباع سنت اور دینی امور کو سیکھنے کی طرف رغبت دلائی۔

اور جب وہ یہاں سے اپنے وطن "پٹنہ" پہونچے تو وہاں بھی دعوت وتبلیغ اور جہاد فی سبیل اللہ کے لئے مسلمانوں کو منظم کرنے میں لگ گئے۔ لوگوں نے انہیں سید صاحب کا خلیفہ وجانشین تسلیم کیا، انہوں نے بیت المال قائم کیا، اور صوبہ بہار میں انہوں نے داعیوں اور مبلغوں کو مقرر کیا، اور اپنے بھائی شیخ عنایت علی کو بنگال میں داعی کی حیثیت سے روانہ کیا اور بعض دوسرے لوگوں کو مختلف ملکوں اور علاقوں میں اصلاح وارشاد اور دین اسلام کی اشاعت کے لئے متعین کیا اس کے ساتھ وہ خود بھی دین اسلام کی اشاعت کے

لئے گاؤں گاؤں اور شہر شہر پھرے اور تبلیغ ودعوت کے اس کام میں وہ ہر مصیبت کو برداشت کرتے اور اسے خدا کی نعمت سمجھتے تھے، اور وہ اپنا ایک ایک لمحہ دعوت وتبلیغ اور اسلام ومسلمانوں کی فلاح وخیر میں صرف کرتے تھے، کبھی آرام وراحت کا خیال بھی ذہن میں نہ لاتے تھے اور اس کے لئے وہ رات دن ایک کر دیا کرتے تھے۔

شیخ ولایت علی صحابہ جیسے اخلاق سے متصف تھے، اور فضل وکمال میں اس قدر بڑھے ہوئے تھے جس سے ان کے اللہ تعالیٰ سے گہرے قرب کا پتہ چلتا ہے وہ فقراء اور مساکین کی طرح سادہ فقیرانہ زندگی بسر کرتے اور دنیا کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، ان کی مجلسیں دل میں دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کی فکر پیدا کرنے والی ہوتی تھیں۔ ان کے چہرہ سے اللہ تعالیٰ کی قدرت کے سامنے انکسار وتواضع، اس کے لئے فکرمندی اور حزن وملال تھا، اکثر وبیشتر وہ اپنے ہاتھوں کو آسمان کی جانب اٹھاتے اور دیر تک خدا تعالیٰ کے سامنے گڑگڑایا کرتے، موٹے جھوٹے لباس اختیار کرتے اور روکھی سوکھی روٹی پر اکتفا کرتے وہ فقراء کے ساتھ بہت ہی معمولی اور متواضع زندگی بسر کرتے تھے اور بیت المال کے پیسوں کو مستحقین پر خرچ کیا کرتے تھے اور اس کے ہدایا مساکین اور پریشان حال لوگوں پر صرف کیا کرتے اور لوگوں کے اندر دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کی طرف رغبت پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں تواضع وانکساری اختیار کرنے کی بھی دعوت دیتے تھے تاکہ انسان کے اندر سے گھمنڈ اور حسب ونسب پر فخر وغرور کا خاتمہ ہو، اور علماء کے دلوں سے رفعت وسربلندی اور زاہدوں کے اندر سے اپنی عبادت پر کلی اعتماد کو ختم کریں اور مالداروں کے اندر کے تکبر وغرور کو زائل کر کے ان کو باوجود فکر وخیال کے اختلاف کے حق وخیر کے متلاشی بننے کی دعوت دیتے تھے، تاکہ ان کے اندر فقراء اور مزدور پیشہ افراد سے محبت پیدا ہو، اور جہلاء اور گناہ گاروں کے کرتوت پر ان کے اندر بے چینی پیدا ہو۔ اور وہ دین کے فروعی مسائل میں میانہ روی سے کام لیں، وہ صرف اس کی دعوت ہی نہیں دیتے تھے بلکہ اپنے کردار سے اس کو ثابت کرتے تھے۔

اور وہ اس کے لئے وعظ ونصیحت کے کسی بھی قیمتی موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے، اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی بات دل سے نکلتی تھی اور دل پر اثر کرتی تھی۔ وہ لوگوں کو ہدایت، دعا اور عبادت، خاص طور سے تہجد وغیرہ پر آمادہ کرتے تھے، اس لئے ان کے متبعین دعا اور تہجد کا اہتمام کرتے تھے، وہ دین پر پورے طور پر کاربند رہتے تھے، اور ان کی ایسی تربیت ہوتی تھی کہ ان کے دل شہادت کے لئے بے چین رہا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے انہیں بہت سی سنتوں کو زندہ کرنے کا موقع عطا فرمایا تھا اور درحقیقت اگر ان کی مسلسل مساعی اور کوششیں نہ رہتیں تو اس ملک سے ان سنتوں کا نام ونشان مٹ گیا ہوتا، اپنے وطن میں دو سال کے قیام کے بعد ادائے حج وزیارت کے لئے انہوں نے حجاز مقدس کا رخ کیا، اور حج وزیارت کے مناسک کی ادائیگی کے بعد وہ یمن تشریف لے گئے، اور کئی عرب علاقوں مثلاً نجد، عسیر، مسقط، حضرموت وغیرہ کا سفر کیا، اور ان علاقوں میں اپنا پورا وقت دین اسلام کی خدمت اور اشاعت میں صرف کیا، اس دیار میں بھی ان کا کار دعوت ثمر آور ہوا اور بہت سے دلوں کو اسلام کے پیغام کی طرف راغب کرنے اور بہت سے لوگوں کے دین اسلام کی آغوش میں پناہ لینے کے وہ محرک بنے اور آخر میں انہوں نے علامہ محمد بن شوکانی سے حدیث شریف کی سماعت کی اور اس کی سند حاصل کی۔

جب حجاز مقدس سے اپنے وطن واپس ہوئے تو اچانک پنجاب کی سرحدوں سے مجاہدین کو طلب کیا اور اپنے بھائی شیخ عنایت کو گلاب سنگھ سے مقابلہ آرائی کے لئے روانہ کیا، اور کچھ عرصہ کے بعد خود سرحد کا قصد کیا اور جنگ کے امور کی تنظیم کی اور گلاب سنگھ اور اس کی فوجوں سے زبردست معرکہ آرائی ہوئی، دو سال تک جنگ جاری رہی، اور جب گلاب سنگھ نے دیکھا کہ مجاہدین سے کوئی راہ فرار نہیں ہے تو اس نے انگریزوں کی آغوش میں پناہ لی، اور ان سے مدد طلب کی اور ان سے معاہدہ کیا اور انہیں مسلسل اپنی حمایت کا عہد وپیمان دیا چنانچہ انگریز مجاہدین کے خلاف محاذ آرائی کے لئے سازش کے جال بننے لگے اور مفتوحہ علاقوں میں لوگوں کو ان کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرنے لگے، آخر کار مجاہدین کو ایسی

بغاوت کا سامنا ہوا جس نے انہیں جانی و مالی ہر قسم کے زبردست نقصان سے دوچار کیا۔

بدنصیبی سے بالاکوٹ کے جس حاکم سے شیخ ولایت نے مدد طلب کی تھی وہ اپنے وعدہ سے پھر گیا اور انگریزوں سے جاملا۔ اور اس نے سید صاحب کے تمام احسانات کو فراموش کر دیا، اور اس نے مسلمانوں کی جانب سے ملنے والی ہر نعمت سے اپنی آنکھیں پھیر لیں، اسے اتنا بھی یاد نہ رہا کہ یہ مقام اس کو محض شیخ ولایت علی اور ان کی جماعت کے طفیل حاصل ہوا ہے، اس نے مسلمانوں سے غداری کی اور دیگر حاکموں کی طرح اس نے بھی ان کے خلاف سازش میں حصہ لیا۔

جب شیخ ولایت علی نے حالات بگڑتے دیکھے اور انہوں نے محسوس کیا کہ اس علاقہ میں دشمن ان کے وجود کو برداشت نہیں کر سکتے، اور ان کے خلاف اٹھنے والی کسی بھی سازش یا سرگرمی کو وہ کچلنے کے درپے ہیں تو انہوں نے مجبور ہو کر پنجاب کی سرحد پر واقع سوات منتقلی کا فیصلہ کیا، اس کے بعد انگریز حاکموں نے انہیں لاہور چلے جانے پر مجبور کیا۔

شیخ ولایت علی لاہور اور اس کے بعد پٹنہ پہونچے، تو شہر کے حاکم کی طرف سے انہیں ایک نوٹس ملا جس میں ان پر اور ان کے بھائی پر دو سو روپئے جرمانہ عائد کیا گیا اور جب تک ان کے سلسلہ میں حکومت کوئی قطعی فیصلہ نہ کر دے وہ اپنے وطن سے باہر جانے کے روادار نہیں ہوں گے۔ شیخ نے شہر کے حاکم کے سامنے عوام کے ایک جم غفیر کی موجودگی میں اس جرمانہ کو ادا کیا، اور عوام کی یہ حالت تھی کہ وہ شیخ کی زیارت کے لئے مشتاق و بے چین تھے اور دل و جان سے ان پر قربان تھے، وہاں سے وہ اپنے گھر واپس ہوئے اور پھر بدستور وعظ و ارشاد، دین کی تعلیم اور تربیت و تزکیہ میں منہمک ہو گئے۔

شیخ ولایت علی کو بدرجۂ مجبوری اپنے وطن کی یہ واپسی راس نہ آئی اور وہ اکثر و بیشتر اس کی وجہ سے پریشان رہا کرتے تھے، اور وہ ہجرت اور جہاد کا ذکر کیا کرتے تھے، جس کے لئے انہوں نے کمر کس لی تھی، اور جب بھی اس کا ذکر کرتے تو بہت ہی حزن و ملال اور رنج و افسوس کے ساتھ کرتے تھے اور زیادہ تر تو ایسا ہوتا کہ وہ مسجد میں جاتے اور خدا کے

حضور میں خوب روتے گڑگڑاتے تھے اور کسی غمزدہ کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے اور وہ اللہ تعالیٰ سے ہجرت اور جہاد کی بہت التجا کرتے اور وہ ایک شعر بھی گنگنایا کرتے جس کا مطلب ہے کہ:

مجھے اس روضہ اور اس کے باغات میں زندگی گزارنے دیجئے اور اگر ہو سکے تو میرا دامن اس کے پھولوں سے باندھ دیجئے۔

جب سزا کے خاتمہ میں صرف چند ماہ رہ گئے تو شیخ اپنے گھر کی صفائی اور اس کی تزئین وغیرہ میں لگ گئے۔ انہوں نے اصطبل کو مضبوط و توانا گھوڑوں سے آباد کیا، اور خوبصورت کبوتروں کو خریدا اس سے لوگوں کو بڑا تعجب ہوا، اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ شاید شیخ پر دنیا کا غلبہ ہو گیا ہے اور مال و دولت کی محبت ان کے قلب میں بیٹھ گئی ہے، اور لوگ ان کے سلسلہ میں کہنے لگے بلکہ ان پر یہ طعنہ زنی کرنے لگے کہ جاہ و مال کی محبت نے ان کے ذہن و دماغ پر قبضہ کر لیا ہے لیکن شیخ بقیہ ماندہ مدت کے بے صبری سے منتظر تھے اور بس اس موقع کی تلاش میں تھے جب انہیں ہجرت کا بہانہ ملے، چنانچہ وقت پورا ہوتے ہی انہوں نے اپنے بعض مخلص ساتھیوں کے ساتھ ہجرت کی اور ان کی ہجرت کے بعد لوگوں کو پتہ چلا تو وہ بھی نکل پڑے اور راستہ میں ان سے جا ملے۔

سب سے پہلے شیخ ولایت علی دہلی تشریف لے گئے وہاں تک انہیں ڈیڑھ سال کا عرصہ لگا، لیکن اس دوران انہوں نے کبھی رشد و ہدایت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا، اور سفر میں ارشاد و دعوت اور اصلاح و ہدایت پر کاربند رہے، دہلی میں انہوں نے پورا مہینہ گزارا وہاں پر جمعہ کو بہت اہم خطاب کرتے، کبھی جامع مسجد دہلی میں تو کبھی مسجد فتح پوری میں، اور ہر جگہ اصلاح و دعوت کا موضوع ہوتا، اور دور دور سے لوگ آ کر ان کے درس میں شریک ہوتے تھے، اور اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جہاد اور موجودہ حکمراں دشمن طبقہ سے نبرد آزمائی پر آمادہ کرنے والی باتوں کو سن کر لوگ فیضیاب ہوتے تھے اور جب وہ ان کے خطاب کو سن کر واپس ہوتے تو دنیا ان کی نگاہوں میں بہت حقیر ہوتی تھی، اور آخرت، جنت اور اس کا عیش

وآرام ان کی نگاہوں کے سامنے ہوتا تھا۔

ایک دن اچانک آخری مغل حکمراں بہادر شاہ ظفر اور بیگم زینت محل نے شیخ کو مدعو کیا، شیخ نے بادشاہ کو متوجہ کرنے اور اس کے سامنے اپنی بات رکھنے کے لئے اس موقع کو بہت غنیمت سمجھا، اور انہوں نے سوچا کہ شاید اس کے اندر بہت زیادہ خیر ہو، بادشاہ کے بہت زیادہ اصرار پر انہوں نے دعوت قبول کی اور لال قلعہ پہونچے بادشاہ نے اپنے دیوان خاص میں آخری درجہ کے اکرام واعزاز اور جوش وجذبہ کے ساتھ ان کا استقبال کیا، اور بہت سے امراء مقربین اور حکومت کے نمائندوں کے سامنے بادشاہ نے شیخ کو اپنی جگہ بٹھایا۔

شیخ نے دیوان میں اپنے وعظ کو شروع کرتے ہوئے سب سے پہلے یہ آیت پڑھی (واعلموا انما الحیاۃ الدنیا لعب ولھو وزینۃ وتفاخر بینکم وتکاثر فی الأموال والأولاد .إلیٰ آخرہ) شیخ نے بہت ہی پرزور انداز میں اس آیت کی تفسیر بیان کی اور دنیاوی زندگی کی ایسی تصویر کشی کی کہ اس کو سن کر دل بیقرار ہو گیا لوگوں کی نگاہوں میں دنیا تاریک ہوگئی اور ان کے سامنے جنت ودوزخ اور دنیا کا فنا ہونا موت اور حساب وکتاب کی تصویر آ گئی اور وہ بے شمار اور دشوار گزار مراحل جن سے انسان کو گذرنا ہوگا، اور شیخ جب اس آیت کی تفسیر پر پہونچے تو وزیر نے ان کے کان میں کہا کہ بادشاہ کے سامنے وہ عذاب اور دوزخ کا ذکر نہ کریں کہ اس سے بادشاہ کو کہیں تکلیف نہ پہونچے تو شیخ نے کہا کہ علماء کی یہ عادت ہوگئی ہے کہ وہ اپنے مواعظ میں جب وہ کسی بادشاہ یا حکمراں کے سامنے وعظ کرتے ہیں تو وہ ایسی چیزیں پیش نہیں کرتے کہ ایسا نہ ہو کہان کو تکلیف پہونچ جائے ان کے مواعظ محض جنت کے تذکرہ تک محدود رہتے ہیں۔

شیخ نے اپنے خطاب کو اسی طرح جاری رکھا گویا کہ انہوں نے وزیر اعظم کی بات ہی نہ سنی ہو اور انہوں نے بادشاہ اور ان کے رنج وتکلیف کی پروا نہیں کی بلکہ انہوں نے دوزخ کے عذاب اور قیامت کے دن کی شدت اور قبر کے عذاب کو مزید صراحت ووضاحت کے ساتھ بیان کیا اور انہوں نے اس کو ایسے دلسوز انداز میں بیان کیا کہ پورے کا پورا مجمع آہ

وبکا سے گونج اٹھا، یہاں تک کہ خود بادشاہ اپنے نفس پر قابو نہ پا سکا اور اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ اور جب بادشاہ کو کچھ سکون ہوا تو اس نے کہا کہ میں نے دنیا کی مذمت میں کچھ اشعار کہے ہیں (اس لئے کہ بہادر شاہ ظفر ایک صاحب دیوان شاعر تھا) شیخ نے اس کے سامنے یہ آیت پڑھی (وإذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا) اور فرمایا کہ یہ بے ادبی ہے۔ بادشاہ خاموش ہو گیا اور اس کے بعد اس نے اپنی زبان نہیں کھولی اس نے شیخ کے وعظ کی طرف پوری توجہ مرکوز کر دی۔ اور شیخ کے وعظ سے بادشاہ نے گہرا اور بہت اچھا تأثر لیا۔

جب شیخ اپنی بات ختم کر چکے تو انہوں نے بادشاہ سے ان اشعار کو سنانے کے فرمائش کی جو اس نے دنیا کی مذمت میں کہے تھے۔ بادشاہ نے وہ اشعار سنائے پھر اپنے مصاحب سے کہا کہ وہ شیخ کو قلعہ میں سیر کرائے اور تھوڑا دل کے سکون کے لئے ان کو ٹہلائے تھوڑی دیر کے بعد شیخ وہاں سے واپس ہو گئے۔

جب تک شیخ دہلی میں رہے بادشاہ ان کے ساتھ اکرام کا معاملہ کرتا رہا اور لوگ بھی ان سے فیضیاب ہوتے رہے اور دین اور علم کی تعلیم حاصل کرتے رہے بہت سے گنہگاروں اور مجرموں نے توبہ کی اور لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے شیخ کے ہاتھ پر بیعت کی، ایسا لگ رہا تھا کہ دہلی اور اس کے اطراف میں ایمان وعمل کی باد بہاری چلی ہو، اور دہلی کے افق پر دین وعلم کی فضا چھا گئی ہو۔

بادشاہ نے شیخ ولایت علی سے درخواست کی کہ اگر وہ قلعہ کے اندر ماہ رمضان گزارنے کے لئے آمادہ ہو جائیں اور قلعہ کے تمام لوگ نماز تراویح میں شریک ہوں تو یہ اس کے لئے بڑی سعادت اور نیک بختی ہوگی۔

لیکن شیخ نے جب بعض دشمنوں کی جانب سے سازش محسوس کی تو انہوں نے بہت تیزی کے ساتھ دہلی سے نکلنے کو غنیمت سمجھا انہوں نے بادشاہ کی اس دعوت کو قبول کرنے سے معذرت کر دی اور دہلی سے لدھیانہ پہونچے اور وہاں سے استھانہ پہونچے اور

وہاں مجاہدوں کی جماعت ایک مدرسہ میں تبدیل ہوگئی جس میں وہ دینی علوم کا درس دیتے تھے۔ اور یہ جماعت مجاہدین ایک ایسی خانقاہ میں تبدیل ہوگئی جہاں تزکیۂ نفس اور اصلاح قلب کا عمل جاری رہتا تھا۔

نواب صدیق حسن خاں صاحب شیخ ولایت علی کے وعظ اور اس کی تاثیر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''کہ شیخ ولایت علی کے وعظ میں جو گہرا تأثر میں نے محسوس کیا وہ میں نے کبھی کسی وعظ میں نہیں دیکھا ان کی صحبت دل کو ایسی حالت میں چھوڑتی ہے کہ اسے دنیاوی زندگی میں کوئی لذت محسوس نہیں ہوتی اور وہ کبھی دنیا کی خرافات میں نہیں پڑتا، دل کے اندر ایک دینی جذبہ گھر کر لیتا ہے اور میں نے ان کی زبان سے ایک فقرہ سنا جس کا مفہوم یہ ہے کہ تم لوگ جلد عشق ومحبت کا ایک دوسرا طریقہ اپناؤ گے۔''

استھانہ میں شیخ کا تین سال قیام رہا پھر ان کو ڈفتھیریا (دمہ) کا مرض ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے وطن واپس ہونے کو مقدر کر دیا تھا آخر تک وہ اس مرض سے شفایاب نہ ہوئے اور ۶۲ رسال کی عمر میں انہوں نے وفات پائی اور اللہ تعالیٰ نے ہجرت دینِ، اسلام کے خلاف معرکہ آرائی اور انفس وآفاق میں اسلام کے جھنڈے کو بلند کرنے کی ان کی آرزوؤں کو پورا فرمایا۔

شیخ ولایت علی کا خاندان، خاندان صادق پور کے نام سے جانا جاتا ہے جو سید احمد شہیدؒ کے مخلص متبعین اور جانشین تھے انہوں نے سید صاحب سے جذبۂ جہاد اور دشمن سے معرکہ آرائی وراثت میں پائی تھی۔ انہوں نے دین وعلم اور جہاد کی اس وراثت کی پوری پوری حفاظت کی اور اس کو بحسن وخوبی ادا کیا۔ اس خاندان کے تمام افراد نے حق کی علم برداری میں ایسی جاں فروشی اور بہادری کا نمونہ پیش کیا کہ ان کے بعد کی تاریخ میں اس کی نظیر اور مثال نہیں ملتی ہے۔

ہندوستان کی اسلامی تاریخ نے اس خاندان کے ایسے مردانِ کار کا مشاہدہ کیا

جن کی بڑی اہمیت اور قیمت رہی ہے۔ان کی زندگی تمام مسلمانوں کے لئے ایک نمونہ اور آئیڈیل تھی اور وہ ان تمام لوگوں کے لئے اسوہ تھی جو حق کی بازیابی اور اعلاء کلمۃ الحق کے لئے تن فروشی پر یقین وعقیدہ رکھتے ہیں۔اور وہ حق کو اس روئے زمین پر غالب کرنا چاہتے ہیں جو ظلم وفساد اور شرک وعصیان سے غبار آلود ہو چکی ہے۔

دعوت واصلاح کے میدان میں مسلسل جد وجہد اور ان مساعی کو انجام دینے والے تنہا شیخ ولایت علی نہیں تھے بلکہ ان کے ساتھ ساتھ ان کے حقیقی بھائی شیخ عنایت علی اور ان کے رفقاء شیخ یحییٰ علی، شیخ احمد اللہ، شیخ فرحت حسین بھی تھے، اور ان تمام کی زندگی اپنی مثال آپ تھی اور ان کی زندگی ایسی تاریخ سے لبریز تھی جس میں اسلام کے دفاع کے لئے ایسے ایسے واقعات پیش آئے کہ زمانہ اور تاریخ ان کو کبھی بھلا نہ سکے گی اور گویا قرآن ان کے سلسلہ میں کہہ رہا ہو: فاستجاب لهم ربهم أني لا أضيع عمل عامل منكم من ذكر وأنثى بعضكم من بعض فالذين هاجروا وأخرجوا من ديارهم وأوذوا في سبيلي وقاتلوا وقتلوا لأكفرن عنهم سيآتهم ولأدخلنهم جنات تجري من تحتها الأنهار ثواب من عندالله والله عنده حسن الثواب۔(آل عمران : ۱۹۵)

ترجمہ: پھر قبول کی ان کی دعائیں ان کے رب نے کہ میں ضائع نہیں کرتا محنت کسی محنت کرنے والے کی، تم میں سے مرد ہو یا عورت، تم آپس میں ایک ہو پھر وہ لوگ کہ ہجرت کی انھوں نے اور نکالے گئے اپنے گھروں سے، اور ستائے گئے میری راہ میں اور لڑے اور مارے گئے البتہ دور کروں گا میں ان سے برائیاں ان کی اور داخل کروں گا ان کو باغوں میں جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں، یہ بدلا ہے اللہ کے ہاں سے، اور اللہ کے ہاں ہے اچھا بدلا۔

حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ

(ولادت ۱۲۲۳ھ وفات ۱۸۹۸ء)

ان صفحات میں ایک ایسی قد آور شخصیت کا تذکرہ مقصود ہے جس کی عظمت و رفعت اور اس کی بلند نگاہی کا زمانہ نے اعتراف کیا اور دینی تفقہ، ایمانی فراست اور ظاہر و باطن کی اجتماعیت میں جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی، جسے دینی امور کی قیادت حاصل تھی اور امورِ زندگی کو سمجھانے میں جس کی برتری مسلم تھی، ایک طرف اس نے روحانی تربیت، اور قلب و نظر کے تزکیہ کا کارنامہ انجام دیا اور خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات کی صدا لگائی تو دوسری جانب انگریزوں کی غلامی کے خلاف شاملی کے تاریخی میدان میں جنگ آزادی کی قیادت کی اور وسعتِ افلاک میں تکبیر مسلسل کا فریضہ ادا کیا۔

ہندوستانی تاریخ کی یہ عظیم شخصیت حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی شخصیت تھی۔ وہ ۱۲۲۳ھ میں سہارنپور کے اطراف میں نانوتہ کے تاریخ ساز مقام پر اپنے ننہال میں پیدا ہوئے۔ جب کہ ان کا آبائی وطن تھانہ بھون ضلع مظفر نگر (یوپی) تھا۔ حاجی صاحب کا سلسلۂ نسب سیدنا فاروق اعظمؓ تک پہونچتا ہے سات سال کی عمر میں ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا تو ان کی تربیت کی ذمہ داری شیخ محمد امین تھانویؒ پر آ پڑی۔ سولہ سال کی عمر میں انہوں نے دہلی کا سفر کیا۔ اور صرف و نحو کے علاوہ خصوصیت سے فن حدیث کی تعلیم حاصل کی، اللہ تعالیٰ کی رحمت نے ان پر علم کے دروازے کھول دئے اور انہیں تھوڑے ہی عرصہ میں دینی فہم اور

کتاب وسنت سے خاص تعلق پیدا ہوگیا۔

صلاح وتقوی پیدائشی طور پر ان کی فطرت میں ودیعت کردیا گیا تھا جس نے آگے چل کر کائنات کے رازہائے سربستہ اور اسرار حکمت وقدرت ان پر واضح کئے اور تعلق مع اللہ، مخلوق خدا پر نظر، اسلام اور مسلمانوں کے مسائل کی فکر اور محبتِ رسول ان کی زندگی کے امتیازی خصائص بن گئے۔

حاجی امداداللہ صاحب، عام علماء ومشائخ کی طرح دین کے کسی ایک پہلو پر عامل نہیں تھے بلکہ وہ دین کو ہمہ جہت اور ہمہ گیر سمجھتے تھے اور زندگی کے وسیع تناظر میں اس کو راہ نما مانتے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کی دینی اور تعلیمی بیداری کے لئے موجودہ حالات کا بڑی گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا۔ اور دلوں میں ایمان وعقیدہ کا بیج بونے کے لئے وسیع تیاری کی۔

حضرت حاجی صاحب، قیادت کے اسٹیج پر اس وقت نمودار ہوئے جب پورا ملک انگریزی سامراج کے خلاف بغاوت کی آگ میں جھلس رہا تھا۔ اور انگریزی استعمار کے خونی پنجے پورے ملک کا گلا دبوچنے کو تیار تھے۔ ایک منظم منصوبہ کے تحت مسلمانوں کو دینی عقائد اور تعلیمی اور تہذیبی ورثہ سے محروم کیا جارہا تھا، اور ان کی اس روشن تاریخ سے ان کا رشتہ کاٹا جا رہا تھا۔ جس میں انہوں نے بڑے عظیم الشان کارنامے انجام دئے تھے اور زمانہ گذرنے کے باوجود جس کو مٹانا اور بھلانا آسان نہیں۔

جب حاجی صاحب نے دین کی خدمت، اور مسلمانوں کو ان کا کھویا ہوا مقام واپس دلانے کے لئے جدوجہد شروع کی تو نصرت غیبی نے ان کی تائید فرمائی اور ان کو ایسی مخلص شخصیات اور علماء کرام میسر آگئے جن کی وجہ سے وہ اس ملک میں انگریزی حکومت کے خلاف برپا ہونے والے ایک انقلاب کی قیادت کرسکے، اور عام مسلمانوں کو ان کا مقام ومرتبہ واپس دلانے میں مثالی کردار ادا کرنے کے قابل ہوئے۔

مسلمانوں میں دینی روح پیدا کرنے اور دلوں کی بجھتی ہوئی انگیٹھیوں کو شعلہ بار

کرنے اوران کوخواب غفلت سے بیدار کرنے کی جدوجہد میں جن اکابر علماء نے ان کا ہاتھ بٹایا ان میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی، حافظ ضامن شہید، اور مولانا منیر احمد نانوتوی کے نام سرفہرست ہیں۔ حاجی صاحب کو جو زمانہ ملا اس میں ملک کے حالات سازگار نہیں تھے، پورا ملک ایک طرح کے انتشار اور بے چینی میں مبتلا تھا، اور پوری ہندوستانی قوم خصوصاً مسلمان انگریزی حکومت کا خاص نشانہ بنے ہوئے تھے، ان پر ظلم وخوف ودہشت اور لوٹ مار کی ہر قسم روا رکھی جاتی تھی اور نفرت وایذا رسانی کی کوئی نہ کوئی تلوار ان کے سر پر ہر آن لٹکی رہتی تھی۔

اس خوفناک صورت حال کے خلاف پورے ملک میں بغاوت کی فضا پیدا ہوگئی اور لوگ انگریزی حکومت کے خاتمہ کے منصوبے بنانے لگے، یہ ۱۸۵۷ء کا سال تھا پوری ہندوستانی قوم انگریزی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی، آندھی طوفان کی طرح بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی اور انگریزوں کے خلاف پورا ملک ایک آواز ہوگیا۔ انقلاب کی اس تحریک کی قیادت ملک کے ممتاز ربانی علماء کے ہاتھوں میں تھی جنہوں نے اپنی جدوجہد اور شعلہ بار تقریروں سے انقلاب کی آگ لگادی، اور جہاد وقتال کی گرمی پیدا کردی۔ اس کے نتیجہ میں ملک کے چپہ چپہ پر انقلاب کی آواز بلند ہونے لگی اور جگہ جگہ انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان خونی جھڑپیں ہوئیں جن میں برادران وطن بھی ان کے شانہ بشانہ رہے ہر جگہ اس پورے انقلاب کی قیادت علماء کرام کے ہاتھوں میں تھی اس پوری جدوجہد کو ''انقلاب ۱۸۵۷ء'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

حاجی امداد اللہ اور ان کے حلیف علماء کرام نے منصوبہ بنایا کہ مختلف علاقوں میں الگ الگ انقلاب اور مسلح جدوجہد کے مرکز بنا کر انگریزوں کے خلاف جنگ کی جائے۔ حاجی صاحب کا وطن ہونے کی وجہ سے تھانہ بھون کو ملک کی آزادی میں ایک مرکزیت حاصل تھی حاجی صاحب نے وہیں اپنی خانقاہ کے ایک گوشہ میں بیٹھ کر انگریزی استعمار کے خلاف بغاوت کا اعلان اور ہندوستان میں ان کی حکومت کے خاتمہ کے لئے جدوجہد شروع کی اور

اس جدوجہد کو تقویت پہونچانے کے لئے اسے مسلمانوں پر اور خصوصاً علماء پر فرض قرار دیا۔

حاجی صاحب کو اس سلسلے میں علماء کی صرف زبانی تائید حاصل نہیں ہوئی بلکہ وہ عملی طور پر ان کا ساتھ دینے کے لئے میدان میں اتر پڑے ان میں سے حافظ محمد ضامن شہید معرکۂ شاملی، مولانا محمد تھانوی، مولانا رشید احمد گنگوہی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حاجی صاحب کے پاس وقتاً فوقتاً تشریف لاتے تھے اور جہاد کے امور پر تبادلۂ خیال کرتے تھے اور اس سلسلہ کی تیاریوں کا جائزہ لیتے رہتے تھے۔

انگریز نے اس جدوجہد کو کچلنے کی کوشش کی، اس نے اپنی عادت کے مطابق پیسوں اور عہدوں کا لالچ دے کر ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیڈروں کو خرید لیا اور باقی لوگوں کی گرفتاریاں شروع کر دیں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے بیشتر بڑے قائدین اور مصلحین کو جیل کی سلاخوں میں ڈال دیا خود سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر اور ان کے اہل خانہ کو قید کر کے رنگون بھیج دیا۔ اور اس طرح ملک سے مغل سلطنت کا عملاً خاتمہ ہو گیا۔

حاجی صاحب اور ان کے رفقاء کار آزادی اور جہاد کی اس تحریک کو پوری طرح عام کر چکے تھے اب انہوں نے اپنے مسائل حل کرنے کے لئے اور انگریزی حکومت کا بائیکاٹ کرنے کے لئے تھانہ بھون کو اپنا مرکز بنایا۔

تھانہ بھون میں آزادی کے متوالے مسلمان مجاہدین جمع ہونے لگے اور انہوں نے حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کو اپنا امیر اور قائد جہاد بنالیا۔ مجاہدین ابھی اپنے قائد کا انتظار ہی کر رہے تھے اچانک انہیں خبر ملی کہ انگریز اپنا توپ خانہ تھانہ بھون سے (جہاں ان کی فوجی چھاؤنی تھی) شاملی لے جا رہے ہیں۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی مجاہدین کا ایک دستہ لیکر ایک محفوظ مقام پر پہونچ گئے۔ اور جب دشمن اپنا توپ خانہ اور گولہ بارود لے کر وہاں سے گزرا تو مولانا نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس پر دھاوا بول دیا جس کے نتیجہ میں دشمن بوکھلا گیا اور وہ اپنا ساز وسامان چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ جس پر مسلمانوں نے مالِ غنیمت کی طرح قبضہ جمالیا۔

اسی طرح دوسرے مجاہدین علماء نے شاملی کے دوسرے انگریزی ٹھکانوں پر چھاپہ مارا اور شدید حملے کئے۔ اور ثابت قدمی اور جوش جہاد کے ساتھ آگے بڑھتے گئے۔ لیکن انگریزی فوج زیادہ تھی اور مسلح تھی انہوں نے مجاہدین پر گولیاں چلانا اور مسلسل گولے پھینکنا شروع کردئے دشمن کی ایک گولی حافظ ضامن کے سینہ میں لگی اور انہوں نے جامِ شہادت نوش فرمایا۔ اس سے دشمنوں کی فوج کو حوصلہ ملا اور انہوں نے مسلمانوں پر لگاتار حملے کئے، اس جنگ میں انگریزوں کا بہت بڑا جانی و مالی خسارہ ہوا لیکن بالآخر مسلمانوں کو شکست ہوگئی۔

۱۸۵۷ء کے اس انقلاب کی ناکامی، ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کا ایک المیہ اور دردناک واقعہ تھا۔ اس کے بعد پورے ملک میں انگریزوں کے اثرات پھیل گئے اور ان کے قدم جم گئے اس انقلاب کی قیادت کے جرم میں مسلمانوں کو طرح طرح سے ستایا گیا اور ان کو تکلیف پہونچائی گئی اس ضمن میں حاجی صاحب کی گرفتاری کے وارنٹ بھی جاری ہوئے اس لئے انہوں نے اپنے بعض دوستوں کے ساتھ کراچی ہوتے ہوئے مکہ مکرمہ کی جانب ہجرت فرمائی اور اسی کو اپنا وطن بنالیا۔

مکہ مکرمہ چلے جانے کے بعد بھی حاجی صاحب کی آزادی کے سلسلہ میں دلچسپی کم نہیں ہوئی وہ مسلسل یہاں کے حالات کی اطلاع رکھتے تھے اور یہاں کے لوگوں کو اپنی ہدایات سے نوازتے رہتے تھے۔ اور تحریک آزادی کی کامیابی کے لئے اپنے پیغامات سے نوازتے تھے۔

انقلاب ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد حاجی صاحب نے بڑی شدت کے ساتھ ایک ایسے مرکز کی ضرورت محسوس کی جہاں وہ ان حملوں سے محفوظ رہ سکیں اور دین اور دنیا کے اپنے سرمایہ کی حفاظت کرسکیں اس کے لئے انہوں نے اپنے احباب کو ایک بڑے دینی ادارہ کے قیام کی راہ دکھائی جس کا مقصد انگریزی حکومت کے مقابلہ میں شکست کھاجانے کے بعد مسلمانوں کے دینی پہلو کی حفاظت اور سیاسی مسائل سے زیادہ انہیں دینی قیادت مہیا کرنا تھا۔

اس غرض کے لئے انہوں نے دیوبند میں ایک بڑا مرکز (دارالعلوم) قائم کیا یہ دینی علوم کی تدریس کا صرف ایک ادارہ نہ تھا بلکہ مسلمانوں کے بچے کھچے تہذیبی سرمایہ کی حفاظت کا ایک محفوظ قلعہ اور دین سے محبت، خودداری اور عزت نفس کی بنیاد پر نئی نسل کی تربیت، اور موجودہ سیاسی حالات کے مقابلے کے لئے ضروری جدوجہد کا ایک وسیع تر پلیٹ فارم تھا۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اپنی کتاب ''مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش'' میں ہندوستان کی دینی قیادت پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اپنے قائم کئے ہوئے اس ادارہ کو وہ دینی علوم اور درس وتدریس اور فقیہ اور معلم پیدا کرنے کا محض ایک مدرسہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسلامی سلطنت کے خاتمہ اور انقلاب کی ناکامی کے بعد وہ اسے داعیوں اور مجاہدوں کی ایک چھاؤنی سمجھتے تھے۔''

بلاشبہ اس ادارہ نے بڑی حد تک اپنا مطلوبہ رول انجام دیا اور جنگ آزادی اور ملکی سیاست میں غیر معمولی حصہ لیا اور اس ملک کو انگریزی قبضہ سے آزاد کرانے اور ایک قومی حکومت کے قیام میں اس ادارہ کا حصہ سب سے زیادہ ہے۔

حاجی امداداللہ مہاجر مکی کی دینی علمی خدمات اس ملک میں روز روشن کی طرح ظاہر ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کی ایمان اور تقویٰ سے بھرپور زندگی میں حاجی صاحب کی مخلصانہ خدمات ان کی جدوجہد اور ان کے زہد وتقوی کا خاص حصہ ہے۔ انہوں نے ان کے اندر جہاد وعمل کی اسپرٹ پیدا کرنے کے علاوہ رضاءِ خداوندی کے حصول کے راستے بھی بتائے، اور بیاباں کی شبِ تاریک میں نور کی شمعیں فروزاں کیں اور زندگی کی یہ حقیقت یاد دلائی کہ زندگی مسلسل جدوجہد اور پیہم عمل کا نام ہے۔

حاجی صاحب اپنے روحانی مقام ومرتبہ میں اپنے بہت سے معاصرین سے فائق تھے اور اللہ کے فضل واحسان کی بدولت انہوں نے ملک کے بگڑتے ہوئے حالات کی اصلاح کی اور معاشرہ کو عیسائیت کے اس خطرہ سے بچایا جو عیسائی مشنریز کی حکومتی سطح پر سرپرستی کے

سبب پیدا ہو گیا تھا۔

حاجی صاحب کو علماء ومشائخ کے یہاں بھی محبوبیت کا مقام حاصل تھا اور اپنی علمی صلاحیت اور معرفت کے باعث وہ دینی قیادت اور بیعت وارشاد کی مسند پر فائز تھے، انگریزی حکومت کے ظلم وجبر اور طرح طرح کے جور واستبداد کی وجہ سے جب دوسرے علماء ومشائخ مسلمانوں کی قیادت سے کنارہ کش ہونے لگے تھے حاجی صاحب نے ملت کی دستگیری کی اور ان کی رہنمائی فرمائی۔

انگریزوں نے اصلاح وتربیت اور بیعت وارشاد کے اس دروازہ کو بند کرنا چاہا اور اس کے لئے دھمکی اور سزا کا ہر حربہ استعمال کیا۔ حکومت سمجھتی تھی کہ حاجی صاحب کی قائدانہ شخصیت کبھی بھی ان کی حکومت کے لئے خطرہ ثابت ہو سکتی ہے اس لئے اس نے اس چراغ کو بجھانے اور اس آواز پر پابندی لگانے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد فرمائی اور انگریز کی تمام کوششوں کے باوجود ان کی دعوتی سرگرمیاں جاری رہیں۔

بالآخر ملکی حالات، اور حکومت کی پابندیوں نے انہیں ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا اور انہوں نے کعبۃ اللہ میں اللہ کے حرم اور اس کے جوار کو اپنی دعوت کا مرکز بنایا۔ اس سے پہلے ہی وہ رسولِ خدا کی چوکھٹ سے وابستہ تھے، اور آپ کی سنتوں کو حرز جاں بنائے ہوئے تھے ان کے دل میں اللہ اور اس کے رسول کی محبت کا سمندر موجزن تھا۔ اور دین صحیح اور قوت ایمانی اور دینی فہم کا انہیں وافر حصہ عطا کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ انہیں محبت کا ایسا جنوں حاصل تھا جس کے سامنے ہر رکاوٹ بے حیثیت ہو جاتی ہے۔ اور جس کے سامنے بڑے بڑے پہاڑ سرنگوں ہو جاتے ہیں ایمان کی ایسی مجنونانہ محبت جب دلوں میں داخل ہوتی ہے تو عجائب کا ظہور ہوتا ہے اور دنیا انگشت بدنداں رہ جاتی ہے۔

حاجی صاحب کا اصلاح وتربیت کا انداز دوسرے علماء ومشائخ سے کچھ علاحدہ نہ تھا لیکن وہ اس میں حالات زمانہ کی رعایت کرتے تھے اور اس سے دور رس نتائج پیدا کر لیتے تھے۔ انہوں نے مسلم معاشرہ کا بڑی گہرائی سے مشاہدہ کیا تھا، اور یہ نتیجہ نکالا تھا کہ معاشرہ کو

سب سے زیادہ دینی عقائد کے فہم اور کتاب وسنت کی تعلیمات کی ضرورت ہے۔

انہوں نے محسوس کیا کہ انگریز ایک تعلیم یافتہ قوم ہے، اور تعلیم کے بغیر کسی قوم کا کوئی وزن یا سیاست میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ انہوں نے پایا کہ اگر ہماری قوم جہالت اور ناواقفیت کے عالم میں پڑی رہے گی تو دینی بنیاد پر صحیح اسلامی معاشرہ قائم نہیں کر سکے گی اور نہ ہی وہ دوسری تہذیبوں کی غلامی سے چھٹکارا حاصل کر سکے گی۔

اس لئے انہوں نے مسلمانوں کے اندر دینی تعلیم اور اسلامی روح پیدا کرنے پر اپنی توجہ مرکوز کی۔ اور تعلیم وثقافت کی اشاعت کو اپنا نصب العین بنایا۔ ان کی خواہش تھی کہ دین کی فہم کا یہ رجحان عام ہو جائے اور مسلمان احساس کمتری سے محفوظ ہو جائیں اور عقیدہ وایمان کی ہر کمزوری ان کے اندر سے نکل جائے۔

ان کی جدوجہد کے نتیجہ میں علماء ربانی اور مخلص بزرگان دین کی ایک پوری جماعت پیدا ہوئی۔ جس نے اصلاح وتربیت کے میدان میں ان کی پیروی کی اور دعوت وارشاد کے ان کے طریقہ کو اپنایا۔ اور دوسرے علمی اور دینی حلقوں میں ان کی دعوت اور فکر عام کرنے کے لئے جدوجہد کی۔

ان مخلص علماء کرام کی اس مخلصانہ جدوجہد کی پہلی کاوش دیوبند کا مرکزی ادارہ تھا جو حاجی صاحب کے خوابوں کی تعبیر اور ان کی آرزوؤں کی تکمیل تھا۔

دارالعلوم دیوبند کے قیام کے بعد حاجی صاحب کے ایک متوسل عالم حج کے موقع پر مکہ معظمہ حاضر ہوئے اور انہوں نے حاجی صاحب سے درخواست کی کہ ہم لوگوں نے دیوبند میں ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی ہے، آپ سے اس کے لئے دعا کی درخواست ہے۔ حاجی صاحب نے برجستہ جواب دیا:

> ''سبحان اللہ، آپ فرماتے ہیں ہم نے مدرسہ کی بنیاد رکھی ہے۔ کتنے نفوس قدسیہ ہیں جنہوں نے ہندوستان میں دین کی بقاء کے لئے رو رو کر دعائیں کی ہیں اور یہ مدرسہ انہیں کی دعاؤں اور آہوں کا نتیجہ ہے۔''

حاجی صاحب کا یہ جواب پوری وضاحت کے ساتھ ثابت کرتا ہے کہ وہ دل کی گہرائیوں سے یہ تمنا رکھتے تھے کہ مسلمانوں کا کوئی مرکزی دینی ادارہ ہو جو انہیں دینی علوم سکھائے اور اسلامی تعلیمات سے ان کو آشنا کرائے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ملک کے اور مسلمانوں کے موجودہ حالات کی اصلاح کا اس سے بہتر کوئی طریقہ ممکن نہیں۔

خود حاجی صاحب نے حرم کے چاروں طرف ایمان ویقین کے حلقے قائم کردئے اور مخلوق خدا کو فائدہ پہونچانا شروع کیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے سرزمین حجاز میں ان سے دینی خدمت اور مسلمانوں کی تربیت کا بڑا کام لیا۔ اور بیت اللہ کے سایہ میں یہ ایسی بڑی سعادت ہے جس سے بڑھ کر کوئی دوسری سعادت نہیں۔

حاجی صاحب نے (دارالعلوم کی شکل میں) ہندوستان میں علم کی جو شمع جلائی تھی وہ مخالف آندھیوں کے درمیان، اور ناسازگار حالات میں بھی اپنا نور بکھیرتی رہی اور آج تک طالبوں اور حاجت مندوں کے لئے اس کی خدمات کا سلسلہ جاری ہے۔

اسی طرح سرزمین حجاز پر کی جانے والی حاجی صاحب کی خدمات بھی ناقابل فراموش ہیں۔ نہ جانے کتنے دلوں کو انہوں نے نور ایمانی سے بھر دیا۔ کتنی عقلوں اور ذہنوں کو جلا بخشی اور عربوں کے معاشرہ میں دینی غیرت اور قربانی کے جذبات پیدا کردیئے اور دینی فہم اور عمل کے دروازے کھولے۔ اور توقع ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ان حسنات کا اجر حاجی صاحب کے نامۂ اعمال میں لکھا جائے گا۔

حاجی صاحب کی جمادی الثانیہ ۱۳۱۷ھ میں ۸۴ سال کی عمر میں وفات ہوئی۔ یہ پوری مدت انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں بسر فرمائی، اور اس حیات مستعار کے چالیس سال انہوں نے حرم محترم کے جوار میں مکہ مکرمہ میں گذارے، اور اپنے کارناموں کے باعث اسلامی تاریخ میں ایک روشن صفحہ کا اضافہ فرمایا۔

ایک قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ تحریک ندوۃ العلماء کو حاجی صاحب کی بھرپور تائید حاصل رہی اور وہ اس کی بنیادی فکر کے مداح تھے اور ان کے، ارکان ندوۃ العلماء سے اتنے

گہرے تعلقات تھے جس کی وجہ سے انہیں ندوۃ العلماء کا نگرانِ اعلیٰ یا سرپرست سمجھا جا سکتا ہے بعض کاغذات پر ان کے دستخط اور ان کی بعض تائیدی تحریریں اب بھی موجود ہیں۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

قاسم العلوم

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

(۱۲۴۸ھ.....۱۲۹۷ھ)

اگر آپ ہم سے سوال کریں۔ وہ شخص کون ہے جو گذشتہ صدی میں مسلمانوں کی علمی اور ثقافتی تعمیر نو کے لئے اٹھ کھڑا ہوا تھا؟ جس نے ارتداد والحاد کا خطرہ بھانپ لیا تھا اور محسوس کرلیا تھا کہ پوری اسلامی نسل اس خطرۂ عظیم کا شکار ہونے جارہی ہے اور وہ اس کے مقابلے کے لئے کمربستہ ہوگیا؟

اگر آپ ہم سے سوال کریں۔ انیسویں صدی عیسوی کا وہ ہیرو کون ہے جو اس طوفان کے مقابلے میں چٹان بن گیا اور جس نے اس طوفان بلاخیز کے سامنے سد سکندری قائم کردی۔ اس نے باطل کو سرنگوں ہونے پر مجبور کردیا۔ اسلام کی مدد کی اور اسلامی معاشرہ کی حفاظت کا سامان کرڈالا؟

اگر آپ ہم سے پوچھیں اس ملک کا وہ مرد میداں کون ہے جس پر اللہ نے علم ویقین کے دروازے کھول دئے تھے اور انگریزوں کے غلبہ اور ان کی تبلیغی کوششوں کے باوجود جس سے اللہ تعالیٰ نے علم ودین کی خدمت کا بڑا کام لے لیا؟

اگر آپ اس طرح کے چند اور سوالات کریں تو ان سب سوالوں کا ایک ہی جواب ہے کہ وہ شخصیت حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کی شخصیت ہے، وہ اس عالم جلیل کی

شخصیت ہے جو گذشتہ صدی میں افراد سازی اور دعوتِ حق کے صفِ اول کے لوگوں میں شمار کی جاتی ہے۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے گونا گوں امتیازات اور صلاحیتوں سے نوازا تھا اور اپنی انہیں خداداد صلاحیتوں سے انہوں نے حق و باطل کا معرکہ سر کیا۔ وہ اسلامی تاریخ کے اسٹیج پر ایک ممتاز وسیع النظر عالم دین، داعی، مجاہد، ماہر کتاب وسنت اور دین و دنیا کی اجتماعیت کے داعی وحکیم تھے۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں بڑے بڑے عظیم کاموں کی توفیق عطا فرمائی۔ انہوں نے دین کی خدمت کی اور مسلمانوں کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا، وہ سیاست میں داخل ہوئے تاکہ وہ دین کو سربلند کرسکیں، اور غاصب انگریزوں کو ملکی سیاست سے نکال باہر کریں۔ انہوں نے مسلمانوں کو دینی تقاضوں اور حالات کی رعایت کے مطابق تعمیر وطن کی دعوت دی۔

مولانا محمد قاسم صاحب نے اپنے دائرہ کار میں وسعت پیدا کی اور مسلمانوں کو مخالف اسلام تحریکوں سے محفوظ رکھنے کے لئے اور اس ملک میں اسلامی سرمایہ کی حفاظت کے لئے مسلمانوں کو ایک مرکز پر ایک جگہ جمع کرنے کی کوشش کی۔ یہ راستہ دشوار گزار ہونے کے باوجود حاجی امداد اللہؒ کی ملکی اور دینی کوششوں کی وجہ سے اچھوتا نہیں بچا تھا۔ خود علماء کرام اس منصوبہ میں رنگ بھرنے کے لئے کوشاں اور مسلمانوں کے گم گشتہ ماضی کی بازیافت کے لئے فکرمند تھے اور وہ مسلمانوں کو ان کی سابقہ عزت وشوکت اور قوت دفاع کا تحفہ عطا کرنا چاہتے تھے اور ان کی گم شدہ متاع ان کے سپرد کردینے کے خواہشمند تھے

حضرت نانوتوی ۱۲۴۸ھ میں ضلع سہارنپور کے ایک قصبہ نانوتہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیقؓ تک پہونچتا ہے اللہ تعالیٰ نے ان کو بچپن ہی سے ذکاوت وذہانت کے جوہر سے نوازا تھا اس لئے کم عمری میں عام بچوں سے جداگانہ ان کی شناخت تھی۔ مورخین لکھتے ہیں کہ انہوں نے بچپن میں ایک خواب دیکھا تھا جس میں انہیں علم وروحانیت اور علم وعلماء کی قیادت کی بشارت دی گئی تھی۔

دیوبند اور سہارنپور کے بعض اساتذہ سے انہوں نے قرآن کریم اور ابتدائی تعلیم حاصل کی پھر دہلی جا کر اپنی دینی تعلیم کی تکمیل کی اور شاہ عبدالغنی سے حدیث کی اعلیٰ کتابیں پڑھیں، اس کے بعد تلاش معاش کے لئے متعدد جگہ ملازمت کی لیکن ان کی خودداری انہیں کسی بڑے کام اور شایان شان عمل کے لئے آمادہ کرتی رہی، پھر ایک مختصر مدت تک درس وتدریس کے کام میں بھی مشغول رہے لیکن ان کے مزاج اور شخصیت کی گمشدہ متاع اب بھی ہاتھ نہیں آئی۔

طالب علمی کے دوران ہی حاجی امداداللہ مہاجر مکی سے ان کا رابطہ قائم ہوا۔ اور حاجی صاحب کے ارشاد وتربیت کی صلاحیت اور روحانی مرتبہ کی وجہ سے انہوں نے ان کے دستِ حق پرست پر بیعت کرلی اور ان کو اپنا روحانی راہ نما بنالیا۔ انہوں نے حاجی صاحب سے دین خداوندی کی نصرت وخدمت کے نام پر بیعت کی اور اس کے لئے سخت ترین مجاہدے کئے یہاں تک کہ عبادت، ذکر اور مراقبہ کے علاوہ ہر تمنا ان کے دل سے رخصت ہوگئی۔ اور انہوں نے اپنی دیرینہ متاع حاصل کرلی۔

اس طرح بہت کم مدت میں وہ مسند ارشاد پر فائز ہوگئے اور لوگوں کے مرکز عقیدت بن گئے۔ انہوں نے عقل وذہن پر مسلط ہونے والے باطل رجحانات کا اپنی قوتِ ایمانی اور وسیع علم کے ذریعہ مقابلہ کیا۔ اور اس وقت کے مسلم معاشرہ کے بدترین حالات کے خلاف کھل کر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ انہوں نے دیکھا کہ انگریز فولاد وآہن اور تلوار کے سہارے پوری مسلم قوم کو شکار کرلینا چاہتے ہیں اور انہوں نے عیسائی مبلغین اور داعیوں کا پورا جال بچھا رکھا ہے اس طرح وہ اپنی تدبیر اور مکر وفریب سے مسلمانوں میں اسلام سے بدظنی اور عیسائیت کی ترویج کرنا چاہتے ہیں۔ اس خطرہ کا احساس سب سے پہلے علماء کرام نے کیا جن کے سرخیل حاجی امداداللہ مہاجر مکی تھے اس لئے انہوں نے اس خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لئے جدوجہد شروع کردی۔

انگریزوں نے دیکھا کہ ان کی عیسائیت کی تبلیغ میں سب سے بڑی رکاوٹ

یہی علماء ہیں جو مسلمانوں کے دینی قائد ہیں اور اس ملک میں عیسائیت کی تبلیغ کے لئے سد راہ بنے ہوئے ہیں تو انہوں نے اپنی جدوجہد کی رفتار اور بڑھادی اور اسلامی تشخص کے خاتمہ، اس کی عظمت کو دلوں سے نکالنے اور مسلمانوں کے عقائد و مسلمات کو متزلزل کرنے اور مغرب کی مادی تہذیب کی چمک دمک سے ان کی نگاہوں کو خیرہ کرنے کے لئے اپنی سرگرمیاں تیز تر کردیں۔

انگریزوں کو یقین تھا کہ ہندوستان میں ان کی حکومت کی پائیداری اس وقت تک ممکن نہیں جب تک مسلمان راسخ العقیدہ اور اپنے دینی شعائر پر قائم رہیں گے۔ اس لئے انہوں نے اسلام کے عالیشان محل کو زمین بوس کرنے اور مسلمانوں کا ان کے شاندار ورثہ سے رشتہ کاٹنے، اور عالمی قیادت کے اسٹیج پر ان کی قائدانہ حیثیت کو ختم کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔

انگریزی سلطنت نے عیسائیت کے پیغام کو پھیلانے کے لئے ہر قسم کے مکر وفریب سے کام لیا۔ اور اگر علماء کرام کی مخلصانہ جدوجہد ان کا راستہ نہ روک دیتی اور وہ ان کے عزائم کے لئے سد راہ نہ بن جاتی تو مسلمان اپنے دینی جذبات، اسلامی بیداری، اور اپنی قوت کے سرچشمہ سے محروم اور بے گانہ ہوجاتے۔

انگریزی سامراج نے مسلمانوں کے اندر مغربی تعلیم کے فروغ، اور ان کو اسلام سے عیسائیت کی طرف لانے کے لئے عیسائی مبلغین کی ایک بڑی تعداد کا جال شہر در شہر اور قریہ قریہ بچھادیا اور مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے لئے لالچ اور خوف کے تمام حربے اور ہر قسم کی سیاسی قوت استعمال کی۔

لیکن مسلمان غیرت مند علماء نے انگریزی سیاست کے یہ تمام حربے پوری شدت کے ساتھ مکڑی کی جالوں کی طرح توڑ ڈالے ان کے قائد حضرت نانوتوی تھے، وہ جس بستی یا گاؤں کے بارے میں سنتے کہ عیسائی اپنے مذہب کی تبلیغ کے لئے وہاں خیمہ زن ہیں۔ تو حضرت نانوتوی وہاں پہونچ جاتے عوام کے بھرے مجمع میں ان سے مناظرہ

کرتے۔ اور طاقت اور دلائل و براہین کے ذریعہ ان کا منہ بند کر دیتے۔ اور ان کو میدان چھوڑنے پر مجبور کر دیتے۔

حضرت نانوتوی کی عیسائیت کی تردید کی کوششیں مسلسل جاری رہیں اس لئے انگریز اپنی کامیابی سے بدگمان ہونے لگے، اور وہ عیسائیت کی تبلیغ سے مایوس ہوتے گئے۔ انہیں یقین ہوگیا کہ اس ملک کی مٹی عیسائیت کے اس بیج کے لئے سازگار نہیں ہے جسے انہوں نے اس ملک میں بویا ہے اور یہ بیج کبھی بارآور اور ثمر دار نہیں بن سکتا۔ اس سلسلہ میں خود انگریزوں نے حضرت نانوتوی کی برتری، ان کی وسعتِ نظر اور کثرت علم کا اعتراف کیا۔ اور برملا یہ کہنے پر مجبور ہوئے:

''بہت سے علماء اسلام سے ہماری ملاقات ہوئی ہے۔ ہم نے ان کی گفتگو بھی سنی ہے اور ان سے بحث و مباحثہ بھی کیا ہے۔ لیکن حضرت نانوتوی کی شخصیت میں جو چیز جلوہ گر دیکھی وہ دوسرے علماء کے یہاں کہیں نہیں دیکھی''۔

مولانا محمد قاسم نے صرف اتنا نہیں کیا کہ انہوں نے اسلام کے خلاف پھیلائے گئے عیسائی مبلغین کے اعتراضات کے جواب دئے، اور عیسائیت کی باطل چیزیں واشگاف کیں، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے آریہ سماجیوں سے بڑے تاریخ ساز مناظرے کئے، اور ہر بار آریہ سماجی شکست کا منہ دیکھ کر اور میدان چھوڑ کر بھاگے۔ آریہ سماجیوں کو یہ خوف ہونے لگا کہ جھوٹے پروپیگنڈہ کے سبب کہیں مجمع کے سامنے خود ان کی رسوائی نہ ہوجائے اور بجائے اس کے کہ مسلمان ان کے مذہب کے حلقہ بگوش ہوں، کہیں خود ان کی اپنی تعداد نہ گھٹ جائے۔ مولانا نانوتوی کا آریہ سماجیوں کے اس نئے حملہ کو دبانے کے سلسلہ میں بڑا اہم کارنامہ ہے۔ اور اس سلسلہ میں دلوں کو متاثر کرنے والے ان کے بہت سے واقعات ہیں۔ خصوصا پنڈت دیانند سرسوتی کے ساتھ رڑکی میں ہونے والا ان کا تاریخی مناظرہ بڑی شہرت کا حامل ہے۔ یہ مناظرہ پنڈت دیانند کی شکست اور ان کی رسوائی اور جگ ہنسائی میں فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے۔

انگریزی حکومت کے خلاف انقلاب ۱۸۵۷ء اور جنگ آزادی کی قیادت میں پیش پیش ہمارے علماء ہی تھے وہ انگریزی استعمار کے پنجہ سے نجات حاصل کرنے کے لئے اس طرح کے انقلاب کو واحد ذریعہ سمجھتے تھے اس لئے تحریک آزادی کی یہ آگ پورے ملک میں پھیل گئی اور تمام مسلمان اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے۔

۱۸۵۷ء کا سال، انگریزی سلطنت کے خلاف عمومی بغاوت سے شروع ہوا اور عام مسلمان اور علماء اسلام ان کے خلاف ایک عمومی جنگ لڑنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ خود حضرت نانوتوی تھانہ بھون اور شاملی کی مسلمان فوجوں کے قائد تھے یہاں انہوں نے انگریزوں کے خلاف ایک فیصلہ کن جنگ لڑی اور اس موقع پر ایسے خوبصورت کارنامے انجام دئے جو اس ملک کی تاریخ میں سنہرے حروف سے رقم ہیں۔

بعض افسوسناک وجوہات کی بنا پر ۱۸۵۷ء کا یہ انقلاب جب ناکامی پر ختم ہوا تو انگریزوں نے طرح طرح سے پوری مسلمان قوم سے اس کا انتقام لیا اب انہوں نے مسلمانوں کو عیسائی بنانے اور مادیت کی تعلیم کے ذریعہ ان کو اسلام سے برگشتہ کرنے، اور ان کے درمیان مغربی اور یورپی تہذیب پھیلانے پر اپنی توجہ مرکوز کر دی۔ اس نئے حربہ سے اندرونِ خانہ انہوں نے مسلمانوں پر حملہ کیا اور مسلم قوم کو ایک ایسی قوم بنانے کی کوشش کی جن کی صورتیں ہندوستانی ہوں لیکن ان کے ذہن و دماغ مغرب میں ڈھلے ہوئے ہوں۔ اس کے لئے انہوں نے تمام گمراہ کن ذرائع استعمال کئے اور ان کے شیرازہ کو منتشر کرنے اور ان کو جماعتوں میں بانٹ دینے کی کوشش کی۔

اب مسلمانوں کے سامنے اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ انگریزی فوج میں شامل ہو جائیں یا کوئی ایسا راستہ تلاش کریں جس سے وہ اپنے دین پر قائم رہ سکیں اور ان کی خبیث چالوں سے محفوظ رہیں۔ اس کے لئے علماء اسلام خصوصاً حضرت نانوتوی نے دینی تعلیم کی اشاعت، اور اسلامی تہذیب کی ترویج کے لئے عمومی جدوجہد شروع کی اور یہ تسلیم کیا کہ انگریزی سامراج کے مقابلہ کے لئے یہی ایک طاقتور ہتھیار ہے۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے دیوبند میں ایک بڑے مدرسہ کے قیام کا

منصوبہ بنایا جو مسلمانوں کی دینی پناہ گاہ اور رشد وہدایت کا مرکز ہو۔انہوں نے دیوبند کی ایک جامع مسجد کے کنارے ایک مدرسہ کی ابتدا کی جو دیوبند کے عظیم جامعہ کی خشتِ اول تھی۔ یہ ادارہ اخلاص وایمان کی بنیاد پر قائم ہوا تھا رفتہ رفتہ اس کے دائرہ کار اور اس کی خدمات میں اضافہ ہوتا رہا اور اس وقت سے آج تک یہ ادارہ مسلمانوں کی دینی اور فکری رہ نمائی کا فریضہ انجام دے رہا ہے۔

مدرسہ دیوبند کا سب سے بڑا کارنامہ مسلمانوں کے اندر صحیح دینی فکر اور دینی عقائد ومسلمات کی حفاظت اور اسلام کے راستہ میں جاں سپاری کے جذبات پیدا کرنا ہے۔ اس ادارہ سے بڑے بڑے علماء کرام اور مشائخ پیدا ہوئے جنہوں نے جنگ آزادی میں حصہ لیا اور تحریک آزادی کی قیادت کی۔اور وہ آج تک ملک کے مفادات کے لئے سرگرم عمل ہیں۔

اس کے علاوہ مسلمانوں کے دینی مستقبل کی تعمیر نو کے لئے حضرت نانوتوی کے بے شمار کارنامے اور احسانات ہیں جنہیں ایک لمحہ کے لئے بھی بھلا دینا ممکن نہیں یہ انہیں کی ذات تھی جس نے مسلمانوں کے دینی مستقبل کی حفاظت کے راستے کھولے، اور ذہن وفکر کے دریچے روشن کئے، اور مسلمانوں کو سامراج کی غلامی سے نکالا۔ ہندوستان میں اسلام اور ایمان کے سرمایہ کی حفاظت میں ان کے عظیم ترین کارناموں اور دیرینہ خدمات کا بہت بڑا حصہ ہے۔

متعدد نامور لافانی تصنیفات بھی حضرت نانوتوی نے یادگار چھوڑیں جن سے ان کی علمی وسعت اور فکری گہرائی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ان میں تقریر دل پذیر، آبِ حیات، انتصار الاسلام اور تحذیر الناس خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اس قاسم العلوم اور مجاہد شخصیت نے جمعرات کے دن ۴؍جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ کو وفات پائی اور دیوبند میں مدفون ہوئے۔

مثل ایوان سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا

عالم ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ

(۱۲۲۴ھ.....۱۳۰۹ھ)

یہ میرے لئے سعادت کی بات ہے کہ میں عالم ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے بارے میں کچھ تحریر کروں۔

وہ بزرگ عالم جن کے کارناموں کو ہندوستان میں خلعت دوام کی سند حاصل ہے اور جس نے مسلمانوں کی نسل در نسل حفاظت کا فریضہ انجام دیا اور اپنے چاروں طرف علم و عمل اور خدمت و جہاد کے چلتے پھرتے نمونے قائم کر دئے۔

وہ مجاہد عالم جس نے دین کی ایسے وقت خدمت کی اور جہاد کا آوازہ اس حالت میں بلند کیا جب ملک کی پوری فضا دھما کہ خیز تھی اور حق گوئی کو ایک جرم تصور کیا جاتا تھا۔

تاریخ ہند کا وہ عظیم ہیرو جو ہر آزمائش میں بے خطر کود پڑتا اور قوت کی کمی اور ضعف و اضمحلال کے باوجود ہر مصیبت کے مقابلہ میں ڈٹ جاتا، ہر خطرہ اور آزمائش کا مقابلہ کرتا اور ایک طرف حالات زمانہ اور افراد خانہ کی اصلاح کا فرض ادا کرتا تو دوسری طرف باطل رجحانات اور ملکی حکومت کا رخ پھیر دیتا۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی زندگی محض ایک عظیم عالم اور روحانی پیشوا کی زندگی نہ تھی بلکہ ہر چیز سے پہلے وہ میدان جنگ کے ایک مجاہد کی زندگی تھی۔ وہ حق کی فتح

مندی، دین اور وطن کی حفاظت اور اپنی گم گشتہ عزت وشرافت کے حصول کے لئے دشمن سے برسر پیکار رہے۔ جب کہ دشمن ایسا شاطر تھا جس نے آزادی وحریت سے کھلواڑ جاری رکھنے والے ہندوستانیوں کو اپنا غلام بنائے رکھنے اور ملکی زمین پر اپنا تسلط باقی رکھنے کے لئے ان کے نوجوانوں کو اپنا اسیر بنالیا تھا اور موت ان کے سروں پر رقص کرتی رہتی تھی۔

وہ بہت جلیل القدر، عظیم المرتبت اور بلند منزلت عالم دین تھے، وفور علم، کثرت معلومات اور وسعتِ نظر میں ان کے عہد میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا ان کی عظیم ترین علمی خدمات اور بلند کارناموں کو رہتی دنیا تک بھلایا نہیں جاسکے گا۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی ۱۲۴۶ھ میں معرکۂ بالاکوٹ سے دوسال قبل سہارنپور سے ۱۶ میل دور گنگوہ کے تاریخی شہر میں پیدا ہوئے یہ بستی قدیم زمانے سے بڑے بڑے عارفین وصالحین اور تاریخی ساز شخصیات کا وطن رہی ہے ان کا سلسلہ نسب سیدنا ابو ایوب انصاریؓ سے جاملتا ہے، وہ سات سال کے تھے جب ان کے والد کا انتقال ہوگیا اس لئے ان کی تعلیم کی ذمہ داری ان کے دادا شیخ پیر بخش پر آپڑی اور والدۂ محترمہ نے اپنے کم سن بچے کی نگہداشت اور تعلیم پر خاص محنت کی وہ بچپن ہی سے ذکی الحس اور نیک وصالح تھے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد دینی علوم کی تعلیم کے لئے رام پور کا سفر کیا اور صرف ونحو کی ابتدائی کتابیں مولانا محمد بخش رامپوری سے اخذ کیں۔

سترہ سال کی عمر میں دہلی کا سفر کیا اور وہاں کے بڑے اساتذہ خصوصاً حضرت مولانا مملوک علی نانوتوی کے پاس طلب علم میں مشغول ہوگئے۔ اللہ کی توفیق ہوئی کہ مرحوم دلی کالج، میں تعلیم کے دوران ہی انہیں ایک مخلص وفا شعار دوست اور بھائی میسر آگئے اور حصول علم اور باہمی تبادلہ خیال میں وہ دونوں ایک دوسرے کے معاون ومددگار بن گئے یہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کی ذات گرامی تھی، دہلی کے علمی حلقوں میں یہ دونوں ہی دوست اپنی ذکاوت وذہانت اور اپنی علمی صلاحیتوں کے باعث خاصے مشہور اور ضرب المثل بن گئے تھے۔

حدیث شریف کا فن انہوں نے شاہ عبدالغنی مجددی سے حاصل کیا اور اپنی ذاتی جدوجہد اور ذوق مطالعہ کے باعث اس فن میں کامل دستگاہ حاصل کرلی۔ اور حدیث کے ایک ممتاز صاحبِ نظر محقق عالم دین کی حیثیت سے مشہور ہوگئے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد طالب علموں نے ان کی طرف رجوع کیا۔ یہاں تک کہ یہ فخر وسعادت کی بات سمجھی جانے لگی کہ کوئی شخص ان سے حدیث کا علم حاصل کرے اور ان کے حلقہ درس میں شریک ہوجائے۔

ظاہری علوم کی تکمیل کے بعد حضرت گنگوہی کے سر میں اصلاح باطن کا سودا سمایا اور وہ تزکیۂ قلب اور تقرب الی اللہ کے حصول کے لئے فکرمند ہوئے، اس خواہش اور فکر نے انہیں بے چین کردیا اور اس کے بغیر زندگی دشوار اور ناقابل اعتبار محسوس ہونے لگی۔ انہوں نے اپنے مقصد کے حصول کے لئے شیخ ومرشد کی جستجو شروع کردی اور اس فکر میں سرگرداں رہنے لگے۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں عارف باللہ حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی کی خدمت میں پہونچا دیا۔ حضرت گنگوہی نے حاجی صاحب کے سامنے اپنے شوق طلب کا اظہار کیا اور ایمان ویقین اور نصرتِ دین کے نام پر بیعت کی درخواست کی۔ حاجی صاحب نے ان کی بلند علمی منزلت کا لحاظ کرکے ابتداءً بیعت کرنے سے انکار کردیا۔ لیکن بعد میں حضرت گنگوہی کے پیہم اصرار اور حافظ ضامن صاحب کی سفارش پر انہیں اپنے حلقۂ ارادت میں داخل فرمالیا۔

بیعت ہونے کے بعد حضرت گنگوہی خانقاہ ہی کے ایک گوشہ میں ذکر الٰہی میں مشغول ہوگئے اور سلوک کی منزلیں طے کرنی شروع کردیں۔ چند ہی دنوں میں ان کی حالت بدل گئی، اور حاجی صاحب کی نگرانی میں تقریباً چالیس دنوں کے اندر سلوک ومعرفت اور تعلق مع اللہ کے بلند مقام پر فائز ہوگئے اور خانقاہ تھانہ بھون سے خلافت واجازت سے سرفراز ہوکر اپنے وطن روانہ ہوئے۔ چلتے وقت حاجی صاحب نے ان سے فرمایا:

اگر کوئی تم سے بیعت ہونا چاہے تو انکار مت کرنا۔

حضرت گنگوہی اپنے وطن پہونچے اب وہ زہد وتقویٰ کی عظیم نعمت سے مالا مال تھے اس نعمت کے حصول کے لئے لوگوں کو برسوں کے طویل مجاہدات اور ریاض کی ضرورت ہوتی ہے لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا فضل تھا کہ انہیں یہ نعمت عظمیٰ صرف ڈیڑھ مہینے کی قلیل مدت میں حاصل ہوگئی۔ذلك فضل الله يوتيه من يشاء

حضرت گنگوہی اپنے اوقات کا اکثر حصہ ذکر ومراقبہ،اور عبادت وتلاوت میں بسر کرنے لگے۔اس طرح بستی کی پوری فضا پر توبہ وانابت اور خشوع وخضوع کی کیفیت طاری ہونے لگی اور رفتہ رفتہ منکرات کی آواز مدھم پڑ گئی۔اور لوگوں کے اندر اپنی اصلاح کا جذبہ بیدار ہونے لگا۔حضرت گنگوہی نے ان کی طرف توجہ فرمائی اور ان کے حالات کی اصلاح شروع کردی اللہ تعالیٰ نے اس کے بہترین نتائج پیدا کئے اور ان پر عزت وسعادت کے دروازے کھول دئے۔

اپنے معاشی مسائل کی کفالت کے لئے حضرت نے مطب کا سلسلہ شروع فرمایا اور مریضوں کا علاج کرنے لگے،ان کے ہاتھ میں شفا تھی اس لئے اس کے بہت اچھے نتائج نکلے انہوں نے بڑا آسان اور زود اثر طریقۂ علاج اختیار فرمایا۔وہ اپنے مریضوں کو یا تو سستی دوائیں دیتے یا دیہات میں بلا خرچ مل جانے والی دواؤں کی نشاندہی فرماتے،ساتھ ہی وہ دوائیں زود اثر بھی ہوتی تھیں۔

اصلاح معاشرہ کا میدان بھی ان کی جدوجہد سے خالی نہ رہا انہوں نے معاشرہ سے برائیوں کو ختم کرنے کی جدوجہد کی۔اور راہِ حق کی نشاندہی فرمائی۔نہ جانے کتنے لوگ ان کے انفاس کی گرمی اور رہنمائی سے جادۂ حق پر مستقیم ہوگئے اور اپنا مقصد زندگی حاصل کرلیا۔ان کی سمجھ میں آ گیا کہ کامیابی کا دارومدار عمل اور نیت پر ہے اگر عمل صالح ہے، اور نیت میں اخلاص ہے،تو کامیابی یقینی ہے۔اور انسان خود اپنے اعمال کے اعتبار سے اجر یا سزا کا مستحق بنتا ہے کیونکہ اچھے اور برے راستہ کا انتخاب وہ خود کرتا ہے اور یہی عمل اسے

جنت میں لے جاتا ہے۔ یا دوزخ میں۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

حضرت گنگوہی اسی طرح فساد و بگاڑ کی اصلاح، اور حق و عدالت کے غلبہ کے لئے کوشاں رہے وہ جہاں بھی کوئی منکر دیکھتے غضب ناک ہو جاتے اور طاقت کے ساتھ اس کو روکتے، وہ اس سلسلہ میں اس فرمانِ رسالت پر عامل تھے:

من رأى منكم منكرا فليغيره بيده، فإن لم يستطع فبلسانه، فإن لم يستطع فبقلبه، وذلك اضعف الايمان۔

ترجمہ: ''اگر تم میں سے کوئی شخص کوئی بری بات دیکھے، تو اپنے ہاتھ سے اس کو تبدیل کر دے، اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو اپنی زبان سے، اور اس کی بھی طاقت نہ ہو تو اپنے دل سے۔ اور یہ ایمان کا سب سے کمتر درجہ ہے''۔

انہوں نے انقلاب ۱۸۵۷ء میں بھی قائدانہ شرکت کی اور حق کی نصرت اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو ذلت و غلامی سے بچانے کے لئے انگریزوں سے جہاد کیا۔

جب انقلاب کی آندھی تھمی اور اہل وطن انگریزی حکومت کا خاتمہ کرنے میں ناکام ہو گئے تو انگریزی گورنمنٹ نے باغیوں کے خلاف گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دئے تاکہ انہیں برسر عام گولی ماردی جائے یا سولی دیدی جائے اور انہیں جلاوطن کر دیا جائے یا دائمی طور پر قید کر دیا جائے۔ چونکہ حضرت گنگوہی، حضرت حاجی امداد اللہ، حضرت مولانا محمد قاسم انگریزوں کے خلاف انقلاب اور تحریک جہاد کے سرگرم قائدین میں تھے اس لئے فطری طور پر یہ لوگ انگریزی حکومت کے عتاب کا خاص نشانہ تھے اور پولیس کے لوگ ان کی تلاش میں گھوم رہے تھے۔

حکومت نے ان حضرات کی گرفتاری کرانے، یا ان کی نشاندہی کرنے والے کے لئے ایک بڑی رقم بطور انعام دینے کا اعلان کر دیا۔ بالآخر پولیس حضرت گنگوہی کو گرفتار

کرنے میں کامیاب ہوگئی اور انہیں نظر بند کر دیا گیا۔حکومت نے انہیں سلطنت برطانیہ کا سب سے بڑا دشمن محسوس کیا اور ان پر سخت مقدمہ چلایا۔ایک بار انگریز حاکم نے مولانا سے کہا: آپ ملک میں فساد پھیلاتے ہیں اور فسادیوں کا ساتھ دیتے ہیں۔حضرت نے جواب دیا: تمہارا خیال غلط ہے۔میں نہ تو فسادی ہوں اور نہ فسادیوں کا ساتھ دیتا ہوں۔انگریز نے پھر کہا: تمہارے پاس اسلحہ ہے تم اسے حکومت کے خلاف استعمال کرتے ہو، حضرت نے اپنی تسبیح کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا یہ میرا اسلحہ ہے۔

حضرت گنگوہی قید و بند کی مشقتیں جھیلتے رہے اور ایک قید خانہ سے دوسرے قید خانہ میں منتقل ہوتے رہے۔حکومت نے تفتیشی کاروائی میں بہت سر مارا لیکن وہ حضرت کے خلاف فرد جرم ثابت کرنے میں ناکام رہی اس لئے مجبوراً ان کو رہائی دیدی۔اس طرح حضرت گنگوہی دشمنوں کے قبضہ سے باعزت بری کر دئے گئے جیل کے باہر لوگوں نے جوش و خروش کے ساتھ حضرت کا استقبال کیا اس سے ان کی عظمت کو مزید چار چاند لگ گئے۔اور لوگوں نے انہیں خیر و صلاح کا داعی اور مسلمانوں کا قائد و راہ نما تسلیم کر لیا۔

حضرت گنگوہی نے قید خانہ میں اسوۂ یوسفی کی اتباع کی سعادت بھی حاصل کی۔قیدیوں کی بڑی جماعت آپ کے ذریعہ فیضیاب ہوئی اور ان میں اخلاص عمل اور ایمان باللہ کی کیفیت پیدا ہوگئی۔جیل سے باہر آنے کے بعد لوگوں کا رجوع بہت بڑھ گیا اور وہ جوق در جوق ان کے دست حق پرست پر بیعت ہونے لگے اور راہ خدا میں مر مٹنے کا جذبہ پیدا کرنے لگے۔لوگوں کی عمومی توجہ دیکھ کر آپ نے دعوت و تعلیم کی راہ سے ان کی وسیع تر بنیادوں پر اصلاح و تربیت کا کام کیا اس دوران انہوں نے مدرسہ دیوبند کی سرپرستی بھی قبول فرمالی اس طرح بہت سے دینی علوم کے فارغین یہاں حاضر ہوتے اور قرآن و سنت کا درس لیتے۔حضرت گنگوہی بگڑے ہوئے حالات کی اصلاح کے لئے مسلسل افراد سازی کرتے رہے یہاں تک کہ ایسے افراد کی ایک جماعت تیار ہوگئی جو علم و دین اور جہاد و اصلاح کی اجتماعیت پر کاربند تھی، اور مدرسہ دیوبند ایک چھاؤنی بن گیا تھا جہاں سے علماء عارفین اور

مصلحین ومجاہدین تیار ہوکر نکلتے تھے۔

علم ودین اور اخلاص وتواضع میں حضرت گنگوہی کا پایہ بہت بلند تھا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسی مقبولیت اور محبوبیت عطا فرمائی تھی جو بہت سے علماء اولیاء اللہ کو بھی میسر نہیں ہوتی۔ ان کے درس میں تاثیر تھی اور وقت میں بے مثال برکت بھی۔ تقوی اور ایمانی صفات سے عاری ایک آدمی ان کے دربار میں حاضر ہوتا اور طاقتور ایمانی کیفیات لیکر واپس لوٹتا۔ ان کے بلند مرتبہ کا خود ان کے پیرومرشد حاجی امداداللہ صاحب کو بھی اعتراف تھا۔ منقول ہے کہ حاجی صاحب نے ان کی خدمت میں ایک ایسے شخص کو بھیجا جس نے حاجی صاحب کی خدمت میں رہ کر تصوف وسلوک کی منزلیں طے کی تھیں اور بہت سے مجاہدے کئے تھے لیکن اس کی مراد حاصل نہیں ہورہی تھی۔ حاجی صاحب نے حضرت گنگوہی کو تحریر فرمایا کہ ان صاحب نے میرے ہاتھ پر بیعت کی ہے، میرے پاس ایک مدت تک ریاضت ومجاہدات بھی کئے ہیں لیکن ان کو نفع نہیں ہوسکا۔ مجھے ان کی کسی کمزوری کا بھی علم نہیں ہے۔ اب میں انہیں آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں ممکن ہے ان کو آپ سے نفع ہو۔

وہ آدمی حاضر ہوا حضرت نے اس سے اس کا مشغلہ دریافت فرمایا، اس نے بتایا کہ درس وتدریس کا کام کرتا ہوں۔ حضرت گنگوہی نے اپنی فراست ایمانی سے اس کی کمزوری بھانپ لی اور حکم دیا کہ تدریس کا مشغلہ روک کر صرف ذکر واذکار اور مراقبہ میں مشغول ہوجاؤ۔ آدمی نے اس پر عمل کیا اور جلد ہی اس کے حالات تبدیل ہوگئے اور اسے منزل مقصود تک رسائی حاصل ہوگئی۔

حضرت حاجی امداداللہ صاحب حضرت گنگوہی کے بلند مرتبہ کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کرتے تھے: میں اپنے سے تعلق رکھنے والوں سے کہا کرتا ہوں کہ مولانا رشید احمد صاحب اور مولانا محمد قاسم صاحب علوم ظاہر اور باطن میں مجھ سے بڑھے ہوئے ہیں اس لئے ان دونوں کو مجھ سے افضل جانو۔

حقیقت میں یہ دونوں حضرات ارشاد وہدایت میں میری ہی جگہ ہیں۔ لوگوں

کو چاہئے کہ ان کے وجود کو غنیمت سمجھیں کیونکہ ایسے لوگ اس دور میں مفقود ہیں۔

حاجی صاحب نے ایک اور موقعہ پر فرمایا۔

اگر اللہ تعالیٰ مجھ سے میرے اعمال کے بارے میں پوچھے گا تو میں مولانا رشید احمد اور مولانا محمد قاسم کو پیش کردوں گا۔

ایک مرتبہ فرمایا:

لوگوں کو میرے پاس آنے کی ضرورت نہیں۔ پیرومرشد بنانے کے لئے مولانا رشید احمد صاحب کافی ہیں۔

ایک آدمی حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادی کی خدمت میں حاضر ہوا اور شکایت کی کہ حکومت نے میرے بھائی کو پکڑ لیا ہے اور تین لاکھ روپئے مالی جرمانہ عائد کیا ہے۔ اس نے حضرت سے دعا کی درخواست کی، مولانا نے فرمایا مولانا رشید احمد صاحب کے پاس جاؤ اور ان سے اپنے بھائی کے لئے دعا کرواؤ، ان کی رہائی انہیں کی دعا پر موقوف ہے۔ میں اور اس دنیا کے تمام اولیاء مل کر بھی اگر دعا کریں گے تو حضرت گنگوہی جیسا نفع نہیں ہوگا، وہ اللہ کے مقرب بندے ہیں اور مستجاب الدعوات ہیں، وہ آدمی حضرت گنگوہی کی خدمت میں حاضر ہوا اور دعا کی درخواست کی۔ اللہ تعالیٰ نے مولانا کی دعا قبول فرمائی اور ان کا بھائی رہا کردیا گیا۔

مولانا فضل رحمٰن صاحب نے ایک اور موقع پر فرمایا۔ تم لوگ مجھ سے مولانا گنگوہی کے بارے میں پوچھتے ہو۔ ان کے اندر تو علم و معرفت کا سمندر موج زن ہے۔

حضرت گنگوہی کبھی درس و تدریس کے واسطہ سے اور کبھی اصلاح و تربیت کے واسطہ سے دعوت کے کام میں منہمک رہے۔ اور اس راہ میں اپنی تمام تر خداداد صلاحیتیں وقف کردیں۔ علمی اور عملی میدان میں ان کی بلندی کا بڑے بڑے علماء نے اعتراف کیا اور یہ ان کے اخلاص اور تعلق مع اللہ کی حرارت تھی جس نے انہیں علم و معرفت کے اس بلند مقام تک پہونچایا۔

حضرت گنگوہی نے فریضۂ حج کی ادائیگی کے لئے تین مرتبہ حجاز مقدس کی زیارت کی سعادت حاصل کی۔ اور مناسک حج کی ادائیگی کے بعد ہندوستان لوٹ آئے۔ لیکن ان اسفار میں وہ اپنے ساتھ حرمین شریفین سے دینی جذبات، تعلق مع اللہ، اور عشقِ رسولؐ کی ایسی سوغات لیکر آئے جس کی زندگی بھر انہوں نے اتباع کی، اور جس کی حرارت اور گرمی سے اپنی زندگی کو سرگرم سفر رکھا، انہوں نے اپنی پوری زندگی تعلیمات نبوی کی اشاعت اور حدیث شریف کے درس وتدریس میں وقف کردی۔ اور آخری وقت تک صحاح ستہ کی تدریس کا کام انجام دیتے رہے۔ ان کے شاگردوں میں بہت سے علماء اور محدثین ہوئے جنہوں نے ہندو بیرون ہند میں حدیث نبوی کی خدمت کو اور اس فن شریف میں مہارت کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا۔

آخری عمر میں انہوں نے ایک زمانہ تک حرم نبویؐ میں حدیث شریف کا درس دیا۔ اور پھر عمر کے ۸۷ سال ۷ مہینے ۳ دن گزار کر اس جہان فانی سے رخصت ہوگئے۔ اور گنگوہ میں دفن ہوئے۔

رحمه الله رحمة واسعة

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ

(۱۲۴۹ھ.....۱۳۰۲ھ)

زیرِ نظر تحریر میں ایک ایسی شخصیت کا تذکرہ مقصود ہے جو علم و ذہانت اور تقویٰ وطہارت میں مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی کے ہم پلہ تھی، اور اس ملک کے دگرگوں حالات کے مقابلہ اور دینی رہنمائی کے میدان میں ان کی معاصر تھی۔ ایسی شخصیت جسے دینی بصیرت اور علمی وسعتِ نظر کے ساتھ ساتھ روحانی تعلق اور معرفت کا وافر حصہ ملا تھا۔ وہ شخصیت جسے دیوبند کے عظیم مدرسہ میں سب سے پہلے صدر مدرس بننے کا شرف حاصل ہوا۔ اور اس نے طلبۂ علوم کی دینی رہنمائی کی اور مدرسہ کے دائرہ میں وسعت دی۔ اور ایسے بڑے بڑے فضلا اور کاملین پیدا کئے جنہوں نے آگے چل کر علم و دین کے میدان میں پورے ملک کی قیادت کی۔

یہ شخصیت مولانا محمد یعقوب نانوتوی کی تھی جن کا مولانا محمد قاسم نانوتوی سے خاندانی اور قرابت داری کا تعلق تھا۔ وہ علم و فضل میں بھی ان کے ہم پلہ تھے اور عمر اور شہرت اور بہت سے خصائص و امتیازات بھی ان کے مشابہ تھے۔ ۱۳ر صفر ۱۲۴۹ھ کو ان کا تولد ہوا۔ ان کے والد مولانا مملوک علی نانوتوی اپنے زمانہ کے ممتاز عالم تھے۔ یہ بات گذر چکی ہے کہ وہ مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی کے استاذ اور مربی تھے اور بڑے اساتذہ اور مشائخ میں شمار ہوتے تھے۔ انہوں نے بیشمار طلباء کو درس دیا اور جہالت کی گھنگھور تاریکیاں روشن کیں۔

مولانا محمد یعقوب نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں رہ کر اپنے والد کے پاس

حاصل کی اور متعدد دینی علوم کا درس لیا۔ ان کی عمر جب دس سال کی ہوئی تو ان کے والد مولانا مملوک علی دہلی کے قدیم عربی مدرسہ مرحوم دلی کالج میں صدر مدرس مقرر ہو گئے اور اس مناسبت سے مولانا یعقوب صاحب نے موقع غنیمت جانا اور انھوں نے طلب علم کے لئے دہلی کا قصد کیا۔

مولانا محمد یعقوب نے اپنے والد کے ساتھ اور مولانا محمد قاسم صاحب کی معیت میں دہلی کا سفر کیا اور مولانا مملوک علی صاحب کی نگرانی میں تعلیم شروع کی۔ مولانا نے اپنے دونوں شاگردوں پر پوری توجہ صرف کی اور قلیل مدت میں ان دونوں ہی حضرات کا جوہر علم چمکنے لگا اور درسی صلاحیت پختہ ہو گئی۔

حدیث شریف کا فن مولانا عبدالغنی مجددی کی خدمت میں رہ کر حاصل کیا۔ اور فن حدیث کا ذوق پیدا کر لیا اور اس کی قدر و قیمت اور اہمیت کی وجہ سے اس کو ایک فن کی طرح باقاعدہ حاصل کیا۔ فن حدیث کے اس خصوصی شغف کے باعث وہ دینی علوم کے ممتاز عالم اور دارالعلوم دیوبند کے اولین صدر مدرس مقرر کئے گئے۔ جہاں حدیث کا یہ معزز فن دوسرے تمام اداروں سے زیادہ اہمیت کے ساتھ پڑھایا جاتا ہے اور اس کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

تدریس کتب میں انہیں جس قدر انہماک تھا اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ انکے لئے کسی کتاب کو ایک بار پکڑ لینے کے بعد اس کو چھوڑ دینا مشکل تھا وہ اپنے بے پناہ ملکہ اور نادر ذہانت کی وجہ سے اس کی گہرائیوں میں اتر جاتے اور اس کی پیچیدگیوں پر قابو پا لیتے۔ ان کی شخصیت میں علوم عقلیہ اور نقلیہ کا نادر اجتماع تھا اس سے ان کو دینی حقائق اور دقیق علوم سمجھنے میں مدد ملتی تھی۔ وہ مشکل ترین مسائل کو بغیر کسی دشواری کے حل کر لیتے تھے اور معترضین اور سائلین کو تشفی بخش جوابات سے نوازتے تھے۔

سب سے پہلے تیس روپئے ماہوار پر اجمیر میں ایک مدرسہ میں تدریس کا کام کیا اور ایک مدت تک اس منصب پر فائز رہے۔ پھر مدرسہ کے مہتمم نے ان کو شہر اجمیر کا

نائب حاکم بنانے کی پیشکش کی لیکن مولانا نے انکار کر دیا۔ اسکے بعد انہیں محکمۂ تعلیم میں انسپکٹر جنرل مقرر کر دیا گیا اور ۱۵۰ روپے ماہوار تنخواہ ملنے لگی اس دوران ۱۸۵۷ء کا انقلاب پیش آ گیا۔ تو پولیس نے انہیں مولانا محمد قاسم کے شبہ میں گرفتار کرلیا اور جب تک یہ نہ ثابت ہوا کہ یہ مولانا محمد قاسم نہیں ہیں۔ انہیں جیل میں رہنا پڑا۔

دیوبند میں مدرسہ قائم ہونے کے بعد مولانا محمد قاسم صاحب نے انہیں دیوبند بلالیا اور صدر مدرس بنا دیا۔ وہ مولانا کی طلب پر یہاں تشریف لائے اور حکومت کی بڑی ملازمت پر مدرسہ کی ۲۵ روپے ماہوار کی اس ملازمت کو ترجیح دی۔ اللہ نے ان کے کام میں برکت عطا فرمائی اور انہیں ایسے طلباء نصیب ہوئے جو آگے چل کر دینی علوم کے نابغۂ روزگار علماء اور اسلام کے داعی بنے ان میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن، حضرت مولانا خلیل احمد انبیٹھوی اور مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی، مولانا فتح محمد تھانوی، اور مولانا اشرف علی تھانوی جیسے بالغ نظر حضرات قابلِ ذکر ہیں۔

دینی علوم کی نشر و اشاعت اور ان مخلص علماء اور داعیوں کی بڑی جماعت کو دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج ہندو پاک اور افغانستان اور ایشائے وسطی میں جتنے دینی مدارس اور علماء کبار ہیں وہ سب مدرسہ دیوبند کا، اور اس کے اولین مشائخ کا بالواسطہ یا بلا واسطہ فیضان ہے۔

علم دین کی خدمت، اصلاح نفوس اور فاسد نظریات کی بیخ کنی کے ان تمام کاموں میں مولانا محمد یعقوب صاحب، مولانا محمد قاسم نانوتوی کے شریک کار اور معاون تھے اور انہوں [illegible] مقصد [illegible]ول کے لئے تعلیم و تربیت کو وسیلہ بنایا۔

مولانا نے حا[illegible]داد اللہ مہاجر مکی کے دست حق پرست پر بیعت کی اور ان سے علم باطن حاصل کیا اور [illegible] و معرفت اور تعلق مع اللہ کے اعلیٰ مراتب حاصل کئے۔ اور ایسے صاحبِ حال ہوئے کہ لوگوں میں ان کا رعب تھا اور مقبول عنداللہ سمجھے جاتے تھے۔ اور شاید یہی سبب تھا جس کے سبب انہیں بے شمار مکاشفے ہوتے تھے جو اس ملک کی دینی و علمی

تاریخ میں محفوظ ہیں۔

علم حدیث میں ان کا تبحر بہت معروف اور علمی حلقوں میں مسلم ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ دیوبند جیسے مدرسہ کے صدر مدرس نہ ہوتے اور شیخ الہند اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب جیسے لوگ ان کے شاگرد نہ ہوتے۔ اسی کے ساتھ انکا ادبی ذوق نہایت پاکیزہ اور بلند تھا اور برجستہ شاعری پر قدرت تھی اردو، فارسی، اور عربی تینوں زبانوں میں بیک وقت شعر کہہ لیتے تھے۔

ان کی متعدد کتب اور رسائل ان کے ادبی اور لسانی ذوق وشوق کی شہادت دیتے ہیں اور ان کی وسیع معلومات پر دال ہیں۔

دومرتبہ زیارت حرمین سے مشرف ہوئے، یہ سفر ایسے زمانے میں کئے جب آج جیسے وسائل سفر موجود نہیں تھے، اور حج کا سفر ہندوستانی مسلمانوں کے لئے بڑی مہم جوئی سمجھا جاتا تھا۔

ربیع الاول ۱۳۰۲ھ میں علوم نبوت کی بے مثال خدمت، علم دین کی جدوجہد اور علماء کرام کی ایک پوری جماعت کی تیاری کے بعد آپ نے اس جہانِ فانی کو الوداع کہا۔

مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے